شاعرِ آخر الزماں

جوش ملیح آبادی

ڈاکٹر فضل امام

ماڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولا مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

شاعرِ آخر الزماں
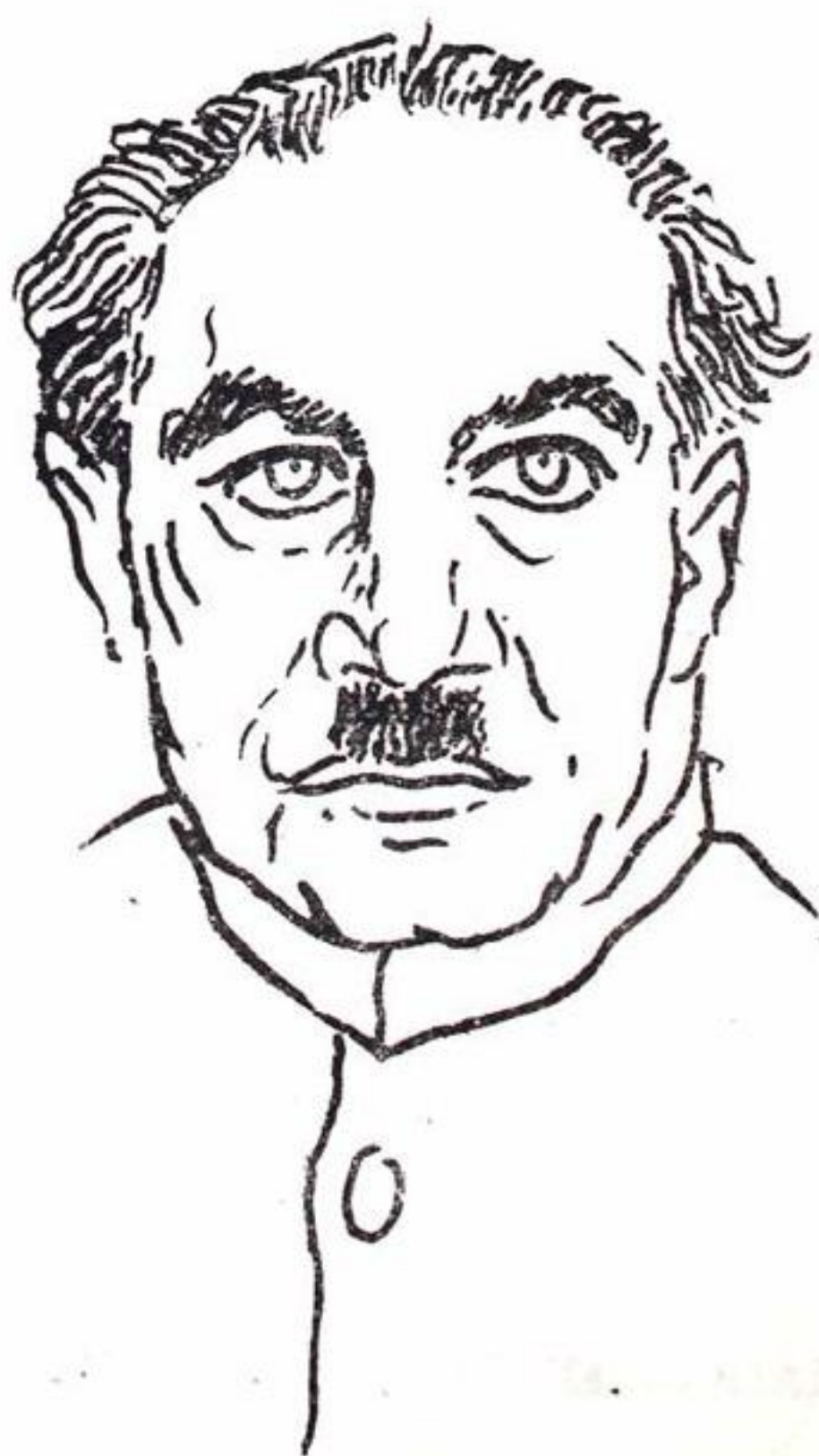
جوش ملیح آبادی

SHAIR-E-AKHIRUZZAMAN : JOSH MALIHABADI

By Dr. FAZL-E-IMAM D.Litt. 30/-

شاعرِ آخر الزماں

جوش ملیح آبادی

ذاکرِ قتلِ امام

موڈرن پبلشنگ ہاؤس

۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج - نئی دہلی - ۲

پہلی بار : ۱۹۸۲ء

قیمت : تیس ۳۰ روپے

کتابت : رہبر الماسی رامپوری۔

طباعت : اعلیٰ پریس۔ دہلی

زیرِ اہتمام:
پریم گوپال متّل

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ ۹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

دانائے رموزِ این و آں ہوں اے جوشؔ
مولائے اکابرِ جہاں ہوں اے جوشؔ
کیوں اہلِ نظر پڑھیں نہ کلمہ میرا
مَیں شاعرِ آخر الزّماں ہوں اے جوشؔ

فہرست

☆

عرضِ ناشر

یہ ایک مُسلّمہ حقیقت ہے کہ زندگی میں ہی شاعرِ اعظم حضرت جوشؔ ملیح آبادی، برِّ صغیر میں اپنی عظمتِ فن کا لوہا منوا چکے تھے۔ ان کی بعض نظموں کا انگریزی اور روسی زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ سبھی یونیورسٹیوں کے بی۔ اے۔ اور ایم۔ اے کے نصاب میں جوشؔ کا کلام شامل رہا ہے۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ ابھی تک کوئی ایسی قابلِ ذکر کتاب منظرِ عام پر نہیں آسکی تھی جو جوشؔ کی شاعری کے مختلف رویّوں اور ان کی شخصیت کا مکمل محاکمہ کرتی۔ مقامِ مسرت ہے کہ اُردو کے نوجوان محقق اور نقاد ڈاکٹر فضل امام نے ہماری درخواست کو قابلِ اعتنا سمجھا اور جوشؔ پر ایک تفصیلی اور بھرپور کتاب تحریر کر دی۔ جو جوشؔ پر ہندو پاک میں یہ پہلی کتاب پیش کرنے کی ہم سعادت اور فخر حاصل کر رہے ہیں، یقین ہے کہ اہلِ علم و ادب ڈاکٹر موصوف کی عرق ریزی کی داد کے ساتھ ہماری پیش کش کی بھی خاطر خواہ پذیرائی فرمائیں گے۔

پریم گوپال مِتّل

جوشؔ ایک نظر میں

۱۸۹۶ء — ولادت

۱۹۰۷ء تبدیلیٔ اسم، شبیر احمد خاں، غلام شبیر سے شبیر حسن خاں۔

عقد — اشرف جہاں بیگم

پہلا شعر ؎

شاعری کیوں نہ راس آئے مجھے

یہ مرا فنِ خاندانی ہے

۱۹۱۳ء ایم۔ اے۔ او۔ کالج، علی گڑھ میں داخل

سینٹ پیٹرس کالج، آگرہ۔

نظم گوئی کا آغاز، پہلی نظم ہلالِ محرم

۱۹۱۶ء اشرف جہاں بیگم کی رخصتی

۱۹۱۸ء رابندر ناتھ ٹیگور کی تحریک پر شانتی نکیتن میں قیام

۱۹۲۰ء رودِ ادب

۱۹۲۱ء مقالاتِ زریں، اوراقِ سحر

۱۹۲۵ء دارالترجمہ، حیدرآباد میں ملازمت

۱۹۳۴ء حیدرآباد سے اخراج

۱۹۳۵ء خطابِ شاعرِ اعظم، عطا کردہ منشی دیا نرائن نگم۔

مدیر، رسالہ کلیم دہلی

۱۹۳۶ء نقش و نگار

شعلہ و شبنم

۱۹۳۷ء فکر و نشاط، جنون و حکمت

۱۹۳۸ء حرف و حکایت

خطابِ "شاعرِ انقلاب" عبدالرزاق ملیح آبادی کا عطا کردہ۔

۱۹۴۰ء رسالہ نیا و کلیم، لکھنؤ سے متعلق۔

۱۹۴۱ء آیات و نغمات

۱۹۴۲ء اشارات

۱۹۴۳ء فلمی دُنیا کا سفر

۱۹۴۴ء عرش و فرش

۱۹۴۵ء رامش و رنگ

۱۹۴۷ء سنبل و سلاسل، سیف و سبو

۱۹۴۸ء مُدیر: رسالہ "آج کل"

۱۹۵۳ء سرود و خروش

۱۹۵۴ء سموم و صبا، پدم بھوشن کا اعزاز

۱۹۵۵ء ترکِ وطن اور پاکستان میں منتقل

۱۹۵۷ء طلوعِ فکر

۱۹۵۸ء ترقیٔ اُردو بورڈ، کراچی سے متعلق

۱۹۶۱ء جشنِ جوشؔ (کراچی)

۱۹۷۳ء یادوں کی برات

۱۹۸۲ء وفات ۲۲ فروری، اِسلام آباد، پاکستان۔

ایک

حالات اور شخصیت

مختصر حالات

نام غلام شبیر (بعد میں شبیر حسن خاں) پہلے شبیر بعد میں جوش تخلص اختیار کیا۔ سنہ ولادت کے متعلق قطعیت کے ساتھ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ مورخین اردو ادب نے ۱۸۹۴ء تسلیم کیا ہے۔ مگر خود جوش کا بیان بڑا دلچسپ ہے۔ وہ اپنے "حادثہ ولادت" کے ذیل میں فرماتے ہیں:۔

"اس امر کو صحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا اس لیے کہ میرے خاندان میں بچوں کی تاریخ ولادت درج کرنے کا رواج نہیں تھا۔ البتہ میری دادی جان نے جو خاندان کی مورخ تھیں، مجھ سے میری ولادت کا جو سن بتایا تھا وہ سن عیسوی کے حساب سے ۱۸۹۶ء تھا یا ۱۸۹۸ء، یہ بھی یاد نہیں رہا بہرحال اپنی عمر کو دو برس بڑھا دینے میں نقصان ہی کیا ہے۔ اس لیے آپ یہ سمجھ لیں کہ میں ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوا تھا ــــ (دو برس اور بوڑھا ہو گیا، ہو جانے دیجیے ماجونی کی نوک سے) ..... البتہ یہ بخوبی یاد ہے کہ دادی نے فرمایا تھا کہ بیٹا تو صبح چار بجے پیدا ہوا تھا[۱]"

جوش کے بھتیجے غوث محمد خاں کے حوالے سے ملتا ہے کہ جوش ان کے والد نواب محمد یوسف خاں سے چار یا پانچ برس چھوٹے تھے۔ نواب محمد یوسف خاں کا سنہ ولادت جوش کے بھتیجے کے بیان کے مطابق ۱۸۸۶ء ہے، لہٰذا اس سے جوش کا سنہ ولادت ۱۸۹۰ء

---

[۱] یادوں کی برات۔ جوش ملیح آبادی ص ۱۸

یا ۱۸۹۱ء قرار پایا ہے۔ لیکن ۱۸۸۶ء جوشؔ کے بڑے بھائی کا سنہ ولادت کسی بنیاد پر تسلیم کر لیا جائے، جب کہ ان کے گھر تاریخ اور سنہ ولادت لکھنے کا رواج ہی نہیں تھا۔[۱] پروفیسر احتشام حسین نے دسمبر ۱۸۹۸ء بقول جوشؔ تحریر فرمایا ہے[۲] بہر کیف ان سب اختلافات و تردیدات کی روشنی میں اگر جوشؔ ملیح آبادی کا سنہ ولادت دسمبر ۱۸۹۶ء تسلیم کر لیا جائے تو زیادہ مناسب رہے گا۔

ملیح آباد ضلع لکھنؤ کا ایک پرانا قصبہ ہے۔ یہاں کے آفریدی پٹھان بڑے دبدبے کے مالک تھے۔ جوشؔ اسی آفریدی خاندان کے چشم و چراغ تھے ان کی ولادت اسی ملیح آباد سے متصل قصبہ کنول ہار میں ہوئی[۳]

ان کے والد بشیر احمد خاں، دادا محمد احمد خاں اور پر دادا فقیر محمد خاں گویا سب شاعر تھے۔ جس میں فقیر محمد خاں گویاؔ کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ گویاؔ، شیخ امام بخش ناسخؔ کے شاگرد تھے۔ جن کا ایک دیوان اور نثر کی ایک نایاب "بستانِ حکمت" اردو شعر و ادب کی تاریخ میں اہمیت کا حامل ہے۔

جوشؔ کی ابتدائی تعلیم اس وقت کے دستور کے مطابق گھر پر فارسی عربی اور اردو کی ہوئی۔ فارسی کے معلم مولوی نیاز علی خاں، اردو کے استاد مولانا طاہر، عربی کے معلم، مولوی قدرت اللہ بیگ اور انگریزی کے معلم ماسٹر گومتی پرشاد تھے۔ اس کے بعد لکھنؤ، علی گڑھ، سیتاپور، اور آگرہ کے مختلف اسکولوں میں سینیر کیمبرج تک کی تعلیم حاصل کی۔

---

[۱] یادوں کی برات۔ جوشؔ ص ۱۸

[۲] انتخاب جوشؔ پروفیسر احتشام حسین و ڈاکٹر مسیح الزماں

[۳] تعارف تاریخ اردو ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ص ۳۱۹

۱۹۱۲ء میں جوشؔ نے ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا اور ممتاز ہاؤس کے کمرہ نمبر ۲۴ میں قیام پذیر ہوئے۔ ان کے خاص معلموں میں جناب واجد علی شیدا صاحب (بہرائچ) اور قاضی عبدالجلیل صاحب مراد آبادی تھے۔ شعروشاعری کا ماحول تو ملا ہی مگر فٹ بال بھی کھیلنے لگے تھے۔

نو ۹ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے اور ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء میں اپنے والد کی معیت میں حضرت مولانا رضا فرنگی محلی کے مشاعرے میں پہلی بار شریک ہوئے۔ عزیز لکھنوی کی شاگردی اختیار کی لیکن بہت جلد اس رسمی شاگردی اور استادی کے رشتے سے آزاد ہو گئے اس لیے کہ عزیز لکھنوی اور ان کی شاعری میں بنیادی فرق تھا مگر ابتدائی دور کی غزلوں میں عزیز لکھنوی کے تغزل کا اثر نمایاں ہے۔

جوشؔ کا ننہال راجستھان کی ایک ریاست دھول پور میں تھا۔ ان کی والدہ خواجہ محمد خاں جاگیردار کی دختر تھیں۔ جوشؔ کے نانا نے اپنی دختر کی تعلیم و تربیت کے لیے لکھنؤ کی مغلانیوں کو مقرر کیا تھا۔ ان کی والدہ کا حضرت علی ابن ابی طالب سے لگاؤ تھا اور گہری عقیدت رکھتی تھیں۔ شاعری سے بھی لگاؤ تھا اور انیس کے مراثی سے خاصا شغف تھا۔ وہ ایام عزا کے علاوہ بھی مراثی انیس پڑھ پڑھ کر اشک افشانی کرتی تھیں۔

جوشؔ کی شادی ۱۹۱۴ء میں نواب محمد نعیم خاں بہادر تعلقہ دار سہلا مئو کے فرزند محمد مقیم خاں کی بیٹی اور سائمہ بیگم کی نواسی اشرف جہاں بیگم سے ہوئی۔ جن کے بطن سے سعیدہ خاتون اور سجاد حیدر خاں پیدا ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد انھیں معاشی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اور تلاش معاش میں مختلف مقامات پر گئے۔ علامہ اقبال کے سفارشی خط پر سر کشن پرشاد نے حیدرآباد میں کوشش کی اور وہاں دارالترجمہ سے وابستہ

ہو گئے یہ تقریباً ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ وہاں سے علاحدہ ہو کر دہلی سے "کلیم" جاری کیا۔ اور بعد میں "آجکل" کے مدیر ہوئے۔ کچھ عرصے تک فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے، لیکن کسی ایک جگہ پر قرار نہیں رکھ سکے۔

۱۹۵۵ء میں ایک مشاعرے میں شرکت کی غرض سے پاکستان گئے، جہاں ان کے پرانے دوست سید ابو طالب نقوی کے بے حد اصرار پر مستقل طور پر وہیں منتقل ہو گئے۔ لیکن انھیں آسودگی نصیب نہ ہو سکی۔ جس کا ذکر انھوں نے اپنی نظموں میں بڑی تکلیف کے ساتھ کیا ہے۔ پاکستان میں ان کی زندگی کے باقی دن بڑی ذہنی اذیت اور کوفت میں گزرے اور آخرش مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء کو انتقال کر گئے۔ جناب مغیث الدین فریدی نے جوش اور فراق کا مشترکہ طور پر قطعۂ تاریخ کہا ہے ملاحظہ ہو:

اُٹھ گئے دنیا سے دونوں باکمال
لُٹ گیا اردو زباں کا طمطراق
ہے دلوں پر نقش تاریخ وفات
عزت افزائے سخن جوش و فراق

۱۹۸۲ء [1]

مندرجہ ذیل مجموعہ ہائے شعر و نثر ان کی یادگار ہیں:—

رُوحِ ادب (نثر و نظم)	۱۹۲۱ء
نقش و نگار	۱۹۳۶ء
شعلہ و شبنم	۱۹۳۶ء
فکر و نشاط	۱۹۳۷ء
جنون و حکمت	۱۹۳۷ء

---

[1] قومی آواز دہلی ایڈیشن مارچ ۱۹۸۲ء

حرف و حکایت	۱۹۳۸ء
آیات و نغمات	۱۹۴۰ء
عرش و فرش	۱۹۴۴ء
رامش و رنگ	۱۹۴۵ء
سنبل و سلاسل	۱۹۴۷ء
سرود و خروش	۱۹۵۳ء
سموم و صبا	۱۹۵۴ء
اشارات (نثری مضامین کا مجموعہ)	۱۹۴۴ء
طلوعِ فکر (مسدس)	۱۹۵۷ء
موجد و مفکر (مسدس)	۱۹۵۷ء
قطرہ و قلزم (رباعیات)	۱۹۵۷ء
الہام و افکار	۱۹۶۱ء
نجوم و جواہر	۱۹۶۰ء
نوادرِ جوش	۱۹۶۰ء
مقالاتِ زریں	۱۹۲۱ء
اوراقِ سحر	۱۹۲۱ء
حسین اور انقلاب	۱۹۴۱ء
سیف اور سبو	۱۹۴۷ء
سرود و خروش	۱۹۵۳ء
یادوں کی برات (نثر)	۱۹۷۱ء

شخصیت علمائے فن کے بموجب شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں گرد و پیش ماحول و فضا، خاندانی رسم و روایت، آبا و اجداد

کا مزاج، صُلبی کیفیات، اور شیرِ مادر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جوش کے مزاج میں افغانیت ان کے سات پشت کی آفریدیت کا نتیجہ ہے۔ نو سال کی عمر میں ہی شاعری سے شغف، گھر کے شعری و ادبی ماحول اور میراث کا ماحصل ہے جو باپ، دادا اور پردادا سے ملا ہے۔ طنطنہ، دبدبہ، اور طمطراق جاگیرداری کی دین ہے ــــــ لیکن ان سب پر جوش کی اُفتادِ طبع، ذہنی رویّہ اور نقطۂ نظر حاوی رہا۔ اسی میں ان کی شخصیت کی جہتیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔

وہ جاگیردار خاندان میں پیدا ہوئے مگر جاگیرداری سے متنفر نظر آتے ہیں انھوں نے جاگیردارانہ نظام کو ظلم و استحصال کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ اپنے اسی ذہنی رویے کے باعث حیدرآباد کے قیام کے دوران انھوں نے نظام حیدرآباد کے خلاف نظم کہی اور حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ سر تیج بہادر سپرو جوش کے والد کے دوستوں میں تھے۔ انھوں نے جب انھیں اس طرح کا مشورہ دیا۔ جس میں جاگیرداروں کی قصیدہ خوانی بھی شامل تھی، تو جوش نے دو ٹوک جواب دیدیا لیکن جب سپرو نے مزید اصرار کیا" جس میں تمسخر اور طنز شامل تھا" تو جوش کی تیوری پر بل پڑ گئے کہ میں ان امراء و رؤسا سے وظیفہ اس لیے قبول کر لیتا ہوں کہ ان کی دولت میں عوام کا حق ہے اور ان سے وظیفہ کی رقم ملنے پر کم از کم جتنی طاقتِ ظلم گھٹتی ہے اتنی ہی مظلومیت کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے۔[1]

حیدرآباد کے دورانِ قیام میں جوش کو جس طرح کی ذہنی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا اُس کا ذکر انھوں نے بڑے دل خراش انداز میں کیا ہے لیکن اسی طرح سے دارالترجمہ میں شامل اہلِ علم کے فضل و کمالات سے جو کسبِ فیض کیا اس کا اعتراف بھی جیسم قلب سے کر گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

---

[1] یادوں کی برات ص ۱۹۷، ۱۹۶

"میری یہ بڑی نمک حرامی ہوئی کہ اگر میں اس امر کا اعتراف نہ کروں کہ شعبہ دارالترجمہ کی وابستگی نے مجھ کو بے حد علمی فائدہ پہنچایا، اور خصوصیت کے ساتھ علامہ عمادی، علامہ طباطبائی اور مرزا محمد ہادی رسوا کے فیضانِ محبت نے مجھ بے سواد کو میرے جہل پر مطلع کر کے مجھ کو ذوق مطالعہ پہ مامور کیا۔ [1]

جوش کی انانیت کی مثال فی زمانہ مشکل سے ملے گی۔ ان کی خوددار اور غیور طبیعت کے سامنے نظام حیدرآباد کی شاہی کئی بار جھک گئی مگر وہ کسی طرح معافی مانگنے کے لیے راضی نہیں ہوئے اور استعفا دے کر واپس آ گئے۔ [2]

جوش کے والد کے مراسم اقتدار انگریزوں سے تھے۔ مگر جوش ہمیشہ انگریزوں سے متنفر رہے۔ والد کے انتقال کے بعد جب انھیں سرکاری ملازمت کی پیش کش یو۔ پی کے گورنر سر ہارکورٹ بٹلر نے کی اور نینی تال بلا بھیجا اور جوش سے صاف صاف لفظوں میں کہا کہ "میں آپ کو بی۔ اے کی شرط سے مستثنیٰ کر کے سرکاری ملازمت دینا چاہتا ہوں۔ آپ ڈپٹی کلکٹر بنیں گے یا اسپیشل منیجر کورٹ آف وارڈ"۔ تو جوش نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش ہو گئے۔ بٹلر کا اصرار بڑھا تو جوش نے کہہ دیا کہ آپ میرے باپ کے دوست ہیں۔ لیکن میں ملازمت نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے کہ آپ کی حکومت غاصبانہ ہے"۔ بٹلر کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے بنگلے سے باہر بلا کر لہراتے ہوئے یونین جیک کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ "اس بلندی پر لہرا رہے یونین جیک پر سے جب خون کا دھارا

---

[1] یادوں کی برات ص ۱۷۵

[2] یادوں کی برات ص ۱۸۵، ۱۸۴

گزر جائے گا تو ہندوستان آزاد ہو گا۔"

جوش نے مسکرا کر جواب دیا کہ ہندوستان کی رگوں میں اتنا خون ہے کہ اس کے صرف ایک صوبے کا نہیں صرف ایک ضلع کا خون اس پھریرے کو آسانی کے ساتھ غرق کر دے گا۔" لہ

انگریز دشمنی جوش کی گھٹی میں پڑ چکی تھی۔ اس کے متعلق جوش کا بیان بڑا دلچسپ ہے جس میں انھوں نے اپنی ایک خادمہ "بڑی بی" کے حوالے سے لکھنؤ میں ہونے والے ایک واقعہ کی تفصیل "یادوں کی برات" میں تحریر کی ہے۔ جوش شدید سے شدید تر حالات میں بھی انگریز اور حکومتِ برطانیہ سے سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ حیدرآباد سے اخراج کے بعد جب وہ شکستہ دل ہو کر واپس وطن آ رہے تھے تو راستے میں جھانسی کے اسٹیشن پر اتر پڑے اور ریاست دتیا جانے کا قصد کیا۔ دتیا میں ان کے دوست قاضی صاحب بہت خلوص سے ملے اور اس عالمِ دربدری میں سولہ سو روپے ماہانہ ریاست سے دلوانے کی آمادگی بھی ظاہر کی۔ اس امدادِ غیبی سے جوش بہت خوش ہوئے لیکن صبح کو ناشتے کے بعد جب قاضی صاحب "سلطنت" نام کے اخبار کے اجرا اور اس کی پالیسی کے سلسلے میں "پرو برٹش" نظریہ اپنانے کے لیے مُصر ہوئے تو جوش کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور یہ کہتے ہوئے چار و ناچار اپنے ننھیال ڈھولپور آ گئے کہا "قاضی صاحب میں آپ کا بے حد شکرگزار ہوں۔ آپ نے تو دل سے چاہا تھا کہ میری زندگی سدھر جائے۔ لیکن میرے مزاج کی افتاد نے

لہ یادوں کی بارات ص ۱۳۱

سارا کھیل بگاڑ کر رکھ دیا۔ آپ نے مجھ پر کرم کرنا چاہا لیکن میں اس کرم کا بار اٹھا نہیں سکا۔ خطا آپ کی نہیں میری ہے ؎

ہر چہ ہست از قامت کوتاہ بے ہنگامہ ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست ؎[1]

جوشؔ وسیع النظر اور وسیع المشرب تھے اس میں ان کے ماحول کا بھی اثر تھا۔ اودھ کا علاقہ ہمیشہ سے فرقہ واریت کے عفریت سے بری تھا۔ چنانچہ اس علاقہ میں ہولی دیوالی بڑے زور شور سے منائی جاتی تھی۔ جوشؔ بھی خوب دل کھول کر رنگ کھیلتے اور چراغاں کرتے۔ مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہیں روا رکھتے تھے۔

وہ مذہبی امور میں بھی بڑی عقیدت سے کام نہیں لیتے تھے بلکہ صلح کل اور استدلال سے ہی گفتگو کرتے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد سنی المذہب تھے لیکن محب اہل بیت تھے۔ لہٰذا مراسم عزا میں انہماک رکھتے تھے۔ گیارہویں محرم کو جوشؔ کے یہاں سے ضریح مبارک اٹھتی تھی۔ نوحہ پڑھتے ہوئے لوگ ضریح کو کاندھا دیتے اور گریہ و شیون کی صدائیں بلند ہو جاتی تھیں۔ ایک دفعہ غالباً ۱۹۱۲ء کا واقعہ ہے کہ جب جوشؔ کے یہاں سے ضریح مبارک اٹھ کر بازار کے چوک میں پہنچی تو مولوی عبدالشکور کے اکسائے ہوئے کچھ لوگ "جھنڈا" پڑھنے کے لیے مصر ہو گئے۔ جس میں جوشؔ کے کچھ خاندانی بزرگوں کی بھی منشا شامل تھی۔ جوشؔ کا بچپنا تھا۔ لیکن یہ حرکت دیکھ کر آگ بگولہ ہو گئے اور ڈانٹ کر کہا کہ "کس کے منہ میں اتنے دانت ہیں کہ وہ ہماری ضریح کے سامنے جھنڈا پڑھے"۔ کچھ ناخوشگوار پہلو

---

[1] یادوں کی برات ص ۱۸۹

بھی سامنے آیا لیکن یہ طے پایا کہ جوشؔ کے والد جناب بشیر احمد خاں صاحب کے پاس معاملہ پہنچایا جائے وہ جو فیصلہ کریں وہ سب کو قبول ہوگا۔ جوشؔ کے والد نے سپاہی بھیج کر انھیں طلب کیا اور کہا کہ ” کیا تم نے جھنڈا روک دیا ہے؟ جوشؔ نے اثبات میں جواب دیا۔ ان کے والد نے مزید سبب دریافت کیا۔ جوشؔ نے تفصیل سے اسباب بیان کیے کہ ” پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے اسکول کے ہم جماعت شیعہ لڑکے میرے بلانے سے یہاں شریک ہونے آئے ہیں اگر ان کے سر پر جھنڈا پڑھا گیا تو ان مہمانوں کی دل شکنی ہوگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ دادی جان شیعہ ہیں جب وہ سنیں گی کہ ان کی ضریح کے سامنے جھنڈا بازی ہوئی ہے تو ان کے دل کو دھکا لگے گا۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ میری یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ امام حسین کی شہادت سے جھنڈا بازی کا تعلق کیا ہے۔ جنازے کے ساتھ رونا پیٹنا ہوتا ہے یا لوگوں کی تعریف کے جھنڈے پڑھے جاتے ہیں۔“

جوشؔ کے والد نے ان لوگوں کو بڑی خشونت کی نگاہ سے دیکھا جو ان کی شکایت کرنے آئے تھے اور کہا کہ ” شبیر تم معقول بات کہتے ہو“ اور خود جوشؔ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے ہولیے کہ ” دیکھنا ہے وہ ایسا کون شخص ہے جو ضریح کے ساتھ جھنڈا پڑھنے کی جسارت کرسکے۔“ [1] اس واقعہ سے جوشؔ کی انصاف پسندی اور رواداری کا ثبوت ملتا ہے۔

جوشؔ کے آباواجداد سنی المذہب تھے۔ لیکن وہ شیعیت کی طرف بڑی شدت سے مائل ہوئے اور خسر اور چچا کے علاوہ خود جوشؔ کے والد نے بھی انھیں محروم الارث قرار دیا اور صرف ایک سو روپے ماہوار کا گزارہ تحریر کردیا لیکن جوشؔ کی پیشانی پر بل نہیں آیا وہ اسی طرح صبر و تحمل کا نمونہ

---

[1] یادوں کی برات ص ۶۴ و ۶۳

بنے رہے۔ ان کے اس کردار کو دیکھ کر ان کے والد نے ایک دن انھیں طلب کیا اور دوسرا وصیت نامہ تحریر کیا، جس کی رو سے جوش کو پورا حق مل گیا اس ذیل میں جوش نے ایک خواب بیان کیا ہے۔ جس میں انھیں لبنا رت دی گئی وہ اسے "سچا خواب" یا "تحت الشعور کا فعال اضطراب" قرار دیتے ہیں لیکن اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ قائلِ فیضِ روحانی تھے۔ تفصیل "یادوں کی برات" میں ملاحظہ کیجیے۔ ؎۱

جوش سبھی بانیانِ مذہب کا احترام کرتے تھے۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ۔ قوت و حیات کے معمار حضرت رسولِ اکرمؐ، مولائے کائنات حضرت علی ابن ابی طالبؑ اور حضرت امام حسینؑ کے دل سے شیدائی تھے۔ ان مقدس ہستیوں کے جوش پرستار رہے لیکن اس پرستاری میں دینی یا اعتقادی نقطۂ نظر نہیں تھا بلکہ انسانی صفات کی بنیادیں تھیں۔ ؎۲

جوش کی شخصیت میں غضب کی مقناطیسی قوت تھی۔ جواہر لال نہرو ان کی دل سے قدر کرتے تھے۔ ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ نواب ٹونک اور ان کے چچا اپنی جائداد کے سلسلے میں دہلی گئے وہاں انھوں نے کنور مہندر سنگھ بیدی سے ملاقات کی اور اپنا مدعا بتایا کہ نواب ٹونک کے چچا تقسیم ہند کے فسادات کے دوران لکھنؤ چلے گئے تھے۔ لیکن سرکار نے ان کی جائداد نیلام کرنے کا طے کر لیا ہے۔ اس ذیل میں ریاستی حکومت اور مرکزی حکام سے بار بار گزارش کی جا چکی ہے۔ مگر کسی نے دھیان نہیں

؎۱ یادوں کی برات ص ۱۱۹ و ۱۲۰

؎۲ یادوں کی برات ص ۲۴۷، ۲۴۶ و ۲۴۵

دیا۔ کنور مہندر سنگھ بیدی نے کہا کہ میرے پاس صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ جوشؔ ملیح آبادی ہیں۔ سب کو ان کے پاس چلیں گے۔ صبح کو جب یہ لوگ جوشؔ صاحب کے یہاں پہنچے تو جوشؔ نے کہا آؤ پنڈت جی کے یہاں چلتے ہیں۔ سب لوگ پنڈت جواہر لال نہرو کی کوٹھی پہ پہنچے وہ بالائی منزل پہ سرکاری فائلوں میں مصروف تھے۔ جوشؔ صاحب اطلاع کرا کے کمرے میں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر میں جواہر لال نہرو خود نیچے آئے۔ جوشؔ صاحب نے نواب ٹونک، نواب مالیر کوٹلہ اور نواب ٹونک کے چچا کا تعارف کرایا اور پورا ماجرا بتایا۔ پنڈت جی سن رہے تھے۔ لیکن مزاج میں کچھ تکدر تھا اس لیے کہا کہ "میں اس میں کیا کر سکتا ہوں، یہ کام تو محکمۂ بحالیات کا ہے۔ اس کا وزیر علاحدہ ہے۔" جوشؔ بہت زود رنج تھے انھوں نے فوراً کہا کہ "ہندوستان کے وزیر اعظم سے یہ جواب سن کر میں حیران تو ہوا ہی ہوں پشیمان بھی ہوں۔ کیونکہ میں نے اپنی بات گنوائی۔"

پنڈت جی خاموشی کے ساتھ کوٹھی کے باہر آگئے جہاں ان کا موٹر کار انتظار کر رہی تھی۔ لیکن جاتے ہوئے کنور مہندر سنگھ بیدی سے کہتے گئے کہ "موہن لال سکسینہ وزیر بحالیات سے ملاقات کر لیجیے۔" کنور مہندر سنگھ بیدی نے جوشؔ سے اصرار کیا کہ آئیے وزیر بحالیات کے پاس چلیں، لیکن جوشؔ ناراض ہو گئے کہ اب وہاں کیا جائیں؟ مگر زیادہ اصرار کرنے کے بعد جب وزیر بحالیات کے پاس پہنچے تو وہ ان لوگوں کا انتظار کر رہے تھے اور ملتے ہی یہ کہا کہ جوشؔ آپ نے یہ کیا غضب کر دیا ــــــ؟ ابھی ابھی پنڈت جی کا فون آیا تھا کہ جوشؔ صاحب آپ کے پاس آ رہے ہیں۔ پٹھان ہیں اور غصے میں ہیں۔ ان کا کام فوراً کر دیجیے گا۔" [۱] ظاہر ہے کہ دوسرے دن ہی

---

[۱] جوشؔ ایک دوست کی نظر میں کنور مہندر سنگھ بیدی
ضمیمہ ہفتہ وار قومی آواز، لکھنؤ (اشاعت ۷ مارچ ۱۹۸۲ء)

کام انجام پا گیا۔

یہ تھی جوشؔ کی عزت اور وقعت پنڈت جواہر لال نہرو جیسے عظیم وزیر اعظم کی نظر میں۔ اس کے علاوہ اور بہت سے واقعات ایسے ہیں جہاں خفیہ پولس کی رپورٹ کے باوجود کہ "پنڈت جواہر لال نہرو فلاں جگہ پر دعوت میں نہ شریک ہوں"۔ جوشؔ کے تعلقِ خاطر کے باعث تمام قواعد و ضوابط کو توڑ کر دعوتوں میں شریک ہوئے اور گھنٹوں ان کے کلام سے محظوظ ہوتے رہے۔

جوشؔ صحتِ زبان کا بڑا خیال رکھتے تھے ان کی موجودگی میں کیا مجال کہ کوئی غلط "ملفظ" غلط لفظ یا غلط جملہ بول جائے اور وہ سرِ محفل ٹوک نہ دیں۔ ان کے گھر کے افراد بھی اس کا خیال رکھتے تھے اور بہت سنبھل سنبھل کر گفتگو کرتے تھے۔ اس ذیل میں جوشؔ کے بھانجے محمد سلیم خاں کا بیان اہمیت رکھتا ہے۔ وہ ان سے ملاقات کے لیے اسلام آباد (پاکستان) مورخہ ۷ر نومبر ۱۹۸۰ء کو تشریف لے گئے تھے۔ ان کا بیان ملاحظہ ہو:

"ان کی بے کسی دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا۔ پھر سکون سے بستر پر بیٹھ گئے۔ تب سلسلۂ کلام شروع ہوا۔ میں بھی زیر و زبر، تنوین، تشدید، واحد اور جمع کے سلسلے میں چوکنا ہو گیا کیونکہ وہ غلط الفاظ اور تلفظ کو قطعی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔" [۱]

جوشؔ فنونِ لطیفہ کے عاشق صادق تھے اس پر سو جان چھڑکتے تھے ان کی نگاہ میں جو شخص اس سے لمس نہیں رکھتا تھا وہ جاہل قرار

---

[۱] اسلام آباد میں آخری ملاقات — محمد سلیم خاں
ہفتہ وار ضمیمہ قومی آواز لکھنؤ مورخہ ۲۱ر مارچ ۱۹۸۲ء

پاتا تھا۔ اور اسے کبھی کبھی مرکز توجہ نہیں بناتے تھے اور نہ اس سے کھلتے تھے۔ بقول محمد سلیم خاں :—

" جوش صاحب کی محفل میں تاجر، ڈاکٹر، سائنس داں، انجینئر وغیرہ جہلا کی فہرست میں شمار کیے جاتے تھے، فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے ادیب، شاعر، نقاد، مصور، مغنی اور موسیقار پڑھے لکھوں کی گنتی میں آتے تھے۔ اس لیے میں بھی موقع کی تلاش میں تھا کہ ادب اور شاعری سے اپنا لگاؤ کسی طرح ظاہر کروں تاکہ نجی گفتگو سے نکل کر ادب پر بات چیت ہو۔ میں نے بتایا کہ ایک دن آپ کے مرحوم " قصر سحر " گیا تھا۔ اس کے قریب ابھی تک ببولوں کی سبک چھاؤں اور مغموم جھاڑیاں آپ کو یاد کر رہی ہیں بہت تعجب اور حسرت سے طویل " اچھا " کہا۔ پھر میں نے شعر سنایا ؎

مست کوئل جب وطن کی وادیوں میں گائے گی

یہ سبک چھاؤں ببولوں کی بہت یاد آئے گی

شعر سن کر تعریف کی اور کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ تم کو بھی شاعری سے لگاؤ ہے۔ ان کی گفتگو کا رخ شاعری کی طرف مڑا، دیر تک غالب اور میر کے فن پر تبصرہ کرتے رہے اور اشعار سناتے رہے۔ "[1]

جوش کو اپنے کلام کی بلاغت اور رفعت کا شدید احساس تھا وہ اپنے فن کی عظمتوں سے واقف تھے۔ ظاہر ہے کہ خودشناسی کبھی بھی عیب نہیں بن سکتی۔ اس لیے ان کی یہ خودشناسی لازمی تھی کیونکہ ہر سچا اور بلند فن کار اپنے فن کا رازدار ہوتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے کبھی اپنے کلام کا مقابلہ دنیا کے

---

[1] اسلام آباد میں آخری ملاقات — محمد سلیم خاں
ہفتہ وار ضمیمہ قومی آواز لکھنؤ مورخہ ۲۱ مارچ ۱۹۸۲ء

کسی شاعر سے نہیں کیا۔ مائل ملیح آبادی نے بڑا دلچسپ انکشاف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"میں نے پوچھا۔ آپ نے دنیا کے جن شاعروں کا کلام پڑھا ہے ان میں سے کس کے کلام کا مقابلہ کرنے سے عاجز رہے ہیں؟"

جوش صاحب نے جواب دیا "میں نے کسی شاعر کا کبھی مقابلہ نہیں کیا ہے۔ ہاں سورۂ رحمن کا جواب لکھنے کی بار بار کوشش کی ہے۔ مگر ہر مرتبہ شکست کھا کر خاموش ہو گیا ہوں"۔ کب تک اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا" اس نظم کو کبھی سورۂ رحمن کا جواب سمجھتا تھا۔ اب پڑھتا ہوں تو اپنی نادانی پر حیرت ہوتی ہے۔

میں نے پوچھا "کیا آپ پھر کبھی اس موضوع پہ لکھنے کی کوشش کریں گے؟"

"نہیں" انھوں نے جواب دیا "وہاں الفاظ اور فصاحت و بلاغت کا دریا بہہ رہا ہے ایک ایک لفظ دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ میرے پاس نہ وہ الفاظ ہیں اور نہ زبان" لہ

اس بیان سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ جوش اعجازِ قرآنی کے قائل ہو گئے تھے اور اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے رسول کی عدم موجودگی میں صبح کو کافی قرار دیتے تھے۔ وہ ہمیشہ حق کے گیت کفر کے انداز میں گاتے رہے۔ جوش کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

تجھے اس سے زیادہ کوئی سمجھا ہی نہیں سکتا
خدا وہ ہے جو حدِ عقل میں آ ہی نہیں سکتا

لہ شمشیرِ بے نیام ۔ شاخِ گل مائل ملیح آبادی
ہفتہ وار ضمیمہ قومی آواز، لکھنؤ مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۸۲ء

سمجھ میں آئے گا اک عمر کے بعد
میں جو کچھ ہم نشیں سمجھا رہا ہوں

نہ جا، ان کفر کی باتوں پہ میری
یہ حق کے گمبٹ ہیں جو گا رہا ہوں

بغاوت کی ہوا کے بازوؤں پہ
وفا کی سمت اڑتا جا رہا ہوں

جسے یوں کھو رہا ہوں ہر قدم پر
اسی کو ہر نفس پہ پا رہا ہوں

اسی کے رمز سے آگاہ ہو کر
اسی کی بات کو جھٹلا رہا ہوں

اسی کے نام کو تاریک کر کے
اسی کی ذات کو چمکا رہا ہوں

مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں جوشؔ کے ایمان، دین اور مذہب کو سمجھا جا سکتا ہے اور ان کے کلام کا غائر مطالعہ یہ بھی ثبوت فراہم کرتا ہے کہ جہاں وہ رسول اکرمؐ، مولائے کائنات، شہید اعظم حضرت امام حسین کا ذکر کرتے ہیں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذواتِ مقدسہ ان کے وجود پر چھا گئی ہیں۔ اس کا مفصل ذکر خود انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری "یادوں کی برات" میں بھی کیا ہے۔

جوشؔ بہت مضبوط قوت ارادی کے مالک تھے وہ جو عزم کر لیتے تھے اس سے کوئی انھیں روک نہیں سکتا تھا۔ دوستی و خلوص کو پابندی سے نبھاتے تھے خواہ اس کے لیے بڑے سے بڑا نقصان کیوں نہ ہو جائے

ان کی شخصیت میں یہ پہلو ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔ جوش جب اخراج دکن کے بعد دھول پور آ گئے اور اپنے پرانے دوست سروپ سنگھ کے یہاں قیام پذیر ہوئے تو اس دوران میں کئی بار مہاراجہ دھول پور سے ملاقات کرتے رہے مگر وہ ملازمت کا وعدہ کرتے ہی رہے۔ ایک روز جب وہ سروپ سنگھ سے ناشتے کے بعد محو گفتگو تھے تو مہاراجہ کا پرائیویٹ سکریٹری آیا اور جوش کو بلا کر تخلیے میں لے گیا جب جوش اور مہاراجہ کے پرائیویٹ سکریٹری ایک کمرے میں گئے تو اس نے کہا کہ سرکار فرماتے ہیں کہ میرا اور جوش صاحب کا معاملہ تو ایسا ہے جیسا درخت اور بکل (چھال) کا ہوتا ہے..... میں جوش صاحب کو ایک اچھا سا عہدہ دینا چاہتا ہوں، مگر دو شرطیں ہیں ایک تو یہ کہ وہ شراب ترک کر دیں اور دوسری یہ ہے کہ سروپ سنگھ سے ملنا چھوڑ دیں"۔ [1]

جوش نے ان شرطوں کو ٹھکرا دیا اور کہا کہ نہ شراب ہی ترک کروں گا اور نہ سروپ سنگھ کی محبت سے کنارہ کش ہوں گا۔ سروپ سنگھ جو اس گفتگو کو سن رہے تھے جوش سے مصر ہوئے کہ آپ ان شرطوں کو تسلیم کر لیں، لیکن جوش ہمالیہ کی طرح اٹل رہے۔ یہاں تک کہ سروپ سنگھ جوش کی اس والہانہ الفت پر گلے مل کر رونے لگے۔ [2]

طنز و ظرافت بہت مشکل فن ہے، خصوصی طور پر نجی گفتگو اور محفلوں میں، لیکن جوش اس فن میں کمال رکھتے تھے۔ یوں تو جوش کی بذلہ سنجی ظرافت اور ذہانت کے بہت سے واقعات مشہور ہیں لیکن ایک دلچسپ لطیفہ کوثر نیازی نے تحریر کیا ہے۔ ایک زمانے میں مولانا کوثر نیازی

---

[1] یادوں کی برات ص ۱۹۰ و ۱۹۱

[2] " " " "

مولوی مودودی کے مقربین میں تھے۔ جوش سے بھی ان کے مراسم تھے
مولوی عرصہ سے پتھری کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ یاد رہے کہ جوش اور
مودودی کے تعلقات حیدرآباد کے دورانِ قیام کے تھے۔

جوش نے کوثر نیازی سے مولوی مودودی کی خیریت معلوم کی تو کوثر
نیازی نے عرض کیا کہ "ان کے گردوں میں پتھری ہے۔"

جوش نے کہا "گویا قدرت انھیں اندر ہی اندر سنگسار
کر رہی ہے۔" [1]

جوش بہت قناعت پسند واقع ہوئے تھے وہ زیادہ کی تلاش
میں نہیں رہتے تھے بلکہ گزر بسر میں ہی یقین رکھتے تھے۔ وہ ہمیشہ تنگ
دست رہے۔ مگر اسی تنگ دستی میں خوش و خرم رہے۔ بقول مولانا
کوثر نیازی:

"۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۷ء تک کا سارا زمانہ کم سے کم جوش کی حد
تک خیریت و عافیت سے گزر گیا۔ اس زمانے میں بہت سے فن کار اور
شاعر بھارت آتے جاتے رہے جوش نے کبھی اس کی خواہش نہ کی۔
اپنے معاشی مسئلے میں بھی وہ قناعت پسند اور خوددار رہے۔ جو رقم ان
کی بندھ گئی سو بندھ گئی اس کے بعد نہ کبھی کوئی مطالبہ کیا نہ کوئی درخواست
پیش کی۔ طبعاً شاہ خرچ ہیں۔ ضروریات یقیناً پوری نہ ہوتی ہوں گی۔ ان
سے کبھی شکوۂ حالات سننے میں نہیں آیا۔" [2]

جوش طلب منفعت کے لیے کبھی حالات سے سمجھوتہ نہ کر سکے اور

---

[1] پاکستان میں مخالفت کی مہم — مولانا کوثر نیازی
[2] " " " "

اپنے اصولوں کے لیے ہمیشہ نبرد آزما رہے۔ اس کے لیے انھیں بہت بڑی بڑی قیمتیں ادا کرنا پڑیں۔ مگر ان کی پیشانی پر بل نہیں آیا اور مصائب و شدائد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے رہے۔ غم کو خوشی میں ڈھالنے کا راز وہ خوب جانتے تھے۔ افسوس کہ انھیں کوئی مسیحا نہ مل سکا اور ایک خونخوار تنہائی ان کی موت کا سبب بن گئی۔ دراصل جوشؔ دنیائے شعر و ادب کا ایک ایسا عندلیب تھا جس کے لیے ابھی گلشن ہی نہیں تعمیر ہو پایا تھا بقول خود ان کے :۔

جہاں سو سال بعد آنا تھا مجھ کو
وہاں سو سال پہلے کھینچ لایا

دراصل جوشؔ کی شخصیت بڑی پُرپیچ ہے اور سادہ بھی وہ کبھی ستر تہوں میں پوشیدہ نظر آتے ہیں اور کبھی خاک پر تڑپتے ہوئے اپنی ذات وصفات کی شناخت کراتے ہوئے۔ بقول پروفیسر احتشام حسین :

"جوشؔ کا معاملہ عجیب ہے جنون و حکمت کی آمیزش، شعلہ و شبنم سے ساز، فکر و نشاط سے وابستگی، عرش و فرش کی سیر، سیف و سبو سے شغل، سموم و صبا سے دلچسپی اور حرفِ آخر کہنے کی آرزو نے جوشؔ کی شخصیت کو پیچیدہ بنا دیا ہے۔ یہ ایک بے قید و بند ہواؤں کی طرح پھرنے والے شاعر اور وقت کی آواز پر کان دھر کر فکر کے سانچے میں ڈھلنے کی آرزومند تفکر پسند انسان کی شخصیت ہے جو اخلاقی اقدار اور بے راہ روی دونوں کو دعوت دیتا ہے کہ اسے سہارا دیں۔ جوشؔ کی زندگی اور اطوار میں کلاسیکیت اور رومانیت، متعین راستوں اور نئی جستجوؤں ، قدامت اور جدت کی ایسی آمیزش ہے کہ وہ بعض اوقات مجموعۂ اضداد نظر آنے لگتے ہیں اور ان کی شخصیت کی

اصل روح گرفت میں آنے سے انکار کر دیتی ہے"۔ ۵۱

جوشؔ کے تعلقات ہندوستان کے سبھی اہم اکابرین علم و ادب اور ارباب حکومت سے رہے۔ سب ان کی قدر و منزلت کرتے رہے "پدم بھوشن" کا خطاب بھی ملا لیکن پاکستان جاکر وہ بہت بجھ گئے اور بار بار ہندوستان آنے کی تمنا کرتے رہے، اور آئے بھی ـــ پر ماں باپ کی پائنتی ابدی نیند سونے کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔ بُرا ہو انقلاب وقت کا۔ جوشؔ کی شخصیت آج بھی امر ہے اور کل بھی امر رہے گی۔ اس لیے کہ ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل علم و فن کی سچی اور گرم روح ہے۔

---

۵۱ انتخاب جوشؔ ص ۱۳

مرتبہ پروفیسر احتشام حسین و ڈاکٹر مسیح الزماں

دو

نظم نگاری

شعر کی تخلیق چاہے عالمِ وجدان میں ہو یا طلسمی دنیا سے متعلق ہو یا ہماری زندگی اور ماحول کی پیداوار ہو لیکن اصل مقصد یہ ہے کہ شعر کی تخلیق کیسے ہوتی ہے اور شعر کے مطالبات کیا ہیں؟ ــــ جذبات کی فراوانی اور شدت خیالات کی وسعت اور استواری، احساس کی پاکیزگی اور طرفہ لذت مشاہدہ کی توانائی اور استحکام، مطالعہ و تجزیہ، تجربہ و نتیجہ کی حقیقتیں اور روح پرور کیفیات ایوانِ شاعری کے ارکان ہیں جس میں حیاتِ انسانی کی نت نئی بدلتی ہوئی اقدار، ادب اور زندگی کو ہم آہنگ بنانے کے لیے آئینہ دکھلاتی ہیں۔ یہ عمل ہر لحظہ نظر آتا ہے اور اسی سے قدیم و جدید کی بحث کا آغاز ہوتا ہے جو شاعر و ادیب اپنے دور یا مستقبل سے بے خبر رہ کر صرف بے وقت کی راگنی چھیڑتا ہے اس پر چند سستے بازاری کھلنڈری اور ناعاقبت اندیش ذاتی مفاد کے لیے ادب کا سودا کرنے والے تو ضرور دھیان دیتے ہیں لیکن متوازن، سنجیدہ، غور و فکر کرنے والا طبقہ، جو فکر و نظر کی تلاش میں رہتا ہے جھوٹوں بھی منہ نہیں لگاتا۔ یہ سلسلہ بڑا دلچسپ اور فکری بصیرت کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ عبرت ناک بھی ہے۔

زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں اسے اردو شاعری کے زمانۂ قریب میں دیکھ لیجیے اور جدید اور قدیم شاعری کا مسئلہ کسی حد تک حل ہو جاتا ہے سودا اور میر ایک ہی عہد اور ایک ہی شہر کے شاعر ہیں۔ لیکن سودا کے مقابل، میر جدید ذہن کا شاعر ہے۔ ذوق کے موازنے میں غالب جدید فکری بصیرت کا حامل ہے۔ ناسخ و آتش ایک ہی دبستان کے نمائندے ہیں

لیکن دونوں کے کلام کا سرسری جائزہ بھی اس نتیجہ پر پہنچا دیتا ہے کہ ناسخ کی تمام تر ذہنی ریاضتوں اور جاں فشانیوں کے باوجود آتش جدید ہے۔ انیس و دبیر کو لکھنؤ کے منچلوں نے دو حصوں میں منقسم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن دبیر کے فنی اکتسابات اور جدید علمیت کے باوصف انیس جدید ہیں۔ دراصل یہ تو تاریخ ادب اردو کے مورخین کی سہل انگاری ہے کہ انھوں نے جدید اور قدیم کا امتیاز پیمانۂ ماہ وسال سے کیا ہے اگر رجحانات و میلانات کے پیش نظر تاریخ ادب کی تدوین اور ترتیب عمل میں آتی۔ تو آج قدیم و جدید کی نہ ختم ہونے والی بحث پیدا ہی نہیں ہوتی۔ اور ہم صحیح طور پر ادبی اور علمی تحریکات و میلانات سے شعوری اور غیر شعوری طور پر فکر انگیز اور نتیجہ خیز مطالعہ کر کے نئے ادب کی بشارت دے سکنے کے اہل ہوتے!

جدید اردو شاعری کا آغاز اچانک نہیں ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ رجحان عرصہ سے پرورش پاتا رہا اور مغربی طرز فکر اردو شعر و ادب میں سرایت کرنے لگے تھے لیکن اس انقلابی تبدیلی کا سہرا محمد حسین آزاد کے اس لکچر کے سر ہے جو انھوں نے ۱۵ اگست ۱۸۶۷ء کو دیا تھا اور کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں انجمن پنجاب کی بنیاد ڈالی گئی تھی جس میں بزم مشاعرہ کی بجائے "بزم مناظمہ" کا آغاز ہوا اور مصرعہ طرح کی بجائے عنوان دیے جانے لگے تھے۔ یہ بزم ۱۸۷۴ء میں قائم ہوئی۔ اور ابتداء میں مولانا محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی نے جدید اور موضوعاتی نظم کی داغ بیل ڈالی اگرچہ شمالی ہند میں میاں نظیر اکبرآبادی، نے نظم کے تصورات سے آگہی بخشی تھی مگر یہ آگہی ایک فرد کی کوشش کا نتیجہ تھی۔

جدید شاعری نے اردو شاعری کے مزاج کو بدل دیا اور اب تصنع، مافوق الفطری عناصر، فرضی عشقیہ داستانوں اور مثنویوں، رعایت لفظی،

دوراز کار تشبیہات و استعارات، استادانہ پُرپیچ تراکیب اور صنعتوں کے برتنے سے اجتناب کی ایک لہر اٹھی۔ اب زندگی اور زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے پیشِ نظر موضوعات شاعری منتخب کیے جانے لگے اور انگریزی شعر و ادب کے اثرات سے ہیئت اور عنوان کے تجربے بھی روا رکھے جانے لگے۔ جس میں حالی، آزاد، مولوی اسماعیل میرٹھی، سرور جہان آبادی، اکبر الہ آبادی، چکبست لکھنوی، اقبال، فیض، فراق، جوش، نظم طباطبائی، وحید الدین سلیم، میراجی، ساغر، حفیظ، احسان دانش، روش، سیماب، محروم، مخدوم، ساحر، وامق، جذبی، خلیل الرحمن اعظمی، اختر انصاری، تصدق حسین خالد، علی جواد زیدی، سلام مچھلی شہری، ن۔م۔ راشد، مجاز لکھنوی، ناصر کاظمی، تاثیر، احمد ندیم قاسمی، سردار جعفری، جمیل مظہری، وغیرہ وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ لیکن اس طرف ذہنوں کو متوجہ کرنے کا کام آزاد نے انجام دیا۔ آزاد کے ایک شاگرد غلام حیدر نثار تحریر کرتے ہیں:

"۸ رمئی ۱۸۷۴ء کو نظم اردو کے عالم میں ایک انقلاب ہوا کہ زبان کی تاریخ میں ایک عمدہ یادگار سمجھا جائے گا۔ نظم مذکور کی آگ ایک چقماق سے نکلی تھی جس کا ایک پرزہ شعرائے آتش بیان کی جیب روشن تھی۔ دوسرا پرزہ امرائے زندہ دل کی گرم طبیعت۔ ایک کی شوخی نے غزل اور قصیدے کو ولادت اور دوسرے کی قدردانی نے اسے پال کر پرورش کیا۔ مخلوق مذکور اسی حالت میں گھبرا رہا ہوکر اپنی حد سے گزر گئی۔ مختصر یہ کہ وہی معمولی مضمون تھے جو پہلے استادوں نے نکالے تھے۔ موجودہ شاعر چبائے ہوئے نوالوں کی طرح انھیں چبا لیتے تھے۔ الفاظ ادل بدل کرتے تھے اور پڑھ پڑھ کر آپس میں خوش ہوتے تھے۔ صاحب ڈائرکٹر بہادر نے سال مذکور میں میرے استاد پروفیسر آزاد کو ایما فرمایا۔ انھوں نے اس مطلب پر مناسب

وقت ایک لکچر لکھا اور شام کی آمد اور رات کی کیفیت ایک مثنوی میں دکھائی۔ حضور ممدوح کی تجویز سے ایک تاریخ مقرر ہوئی۔ جلسہ ہوا اہل علم اہل ذوق جمع ہوئے۔ نثر و نظم پڑھی گئی اور سب نے صلاح کر کے ایک مشاعرہ قائم کیا کہ شعراء ہر قسم کے مضامین پر طبع آزمائی کریں گیارہ مہینے تک مشاعرہ قائم رہا۔ اس وقت نظم مذکور کی شروع پر کچھ لوگوں نے مخالفت کی مگر چودہ برس کے عرصے میں اتنا اثر ہوا کہ اب ہندوستان کے مشہور شہروں میں ویسی نظموں کی آوازیں آتی ہیں"۔

ظاہر ہے کہ لاہور میں جو انقلابی قدم اٹھایا گیا، اس کے اثرات پورے برِ صغیر نے قبول کیے اور اسے سرسید تحریک نے بھی تقویت بخشی۔ رفتہ رفتہ یہ لے عام ہوئی اور جدید نظم پھولنے پھلنے لگی۔ جدید نظم کو جہاں قصیدہ غزل اور مثنوی نے راہ دکھائی ہے وہیں اردو مرثیہ نے بھی رہنمائی کی ہے اس لیے کہ موضوع اور عنوان کے طور پر "اردو مرثیہ" سے زیادہ کوئی مناسب اور موزوں صنفِ سخن نہیں۔ خصوصی طور پر انیس و دبیر نے جو منظر کشی، واقعہ نگاری اور قدرتی کیفیات کو نظم کرنے کا کمال دکھایا ہے وہ اس کے قبل ناپید تھا۔ اگر انیس و دبیر کے مراثی نہ ہوتے تو جدید نظم کو سنورنے اور نکھرنے میں ابھی معلوم نہیں کتنے ہفت خواں طے کرنے پڑتے اور موزوں و موثر ہیئت کی تلاش و جستجو میں بہت زیادہ تجربات سے دوچار ہونا پڑتا

(۱)

آزادی کی تحریک پسندی نے ہمیں حالی اقبال اور جوش جیسے شاعر عطا کیے۔ یہاں ان شاعروں کا موازنہ یا مقابلہ مقصود نہیں بلکہ جوش کی نظم نگاری کا محاکمہ پیشِ نظر ہے جوش نے ماضی کے شعر و ادب سے بھی روشنی حاصل کی اور جدید رنگ و آہنگ سے بھی وابستگی

اختیار کی ہے انھوں نے بعض دشوار اور اہم موضوعات کو بھی اپنایا ہے اور بعض ہنگامی موضوعات کو بھی قالب شعر میں ڈھالا ہے۔ اس افراط و تفریط کے درمیان میں ان کا قد شاعری ناپا جا سکتا ہے۔ وہ شاعر انقلاب بھی ہیں اور شاعر شباب بھی۔ ان کے یہاں جلال و جمال دونوں ملتے ہیں۔ لہذا جوشؔ کی نظم نگاری کا تجزیہ آسان نہیں۔ وہ کسی ایک نظریے کے پابند نہیں نہ کوئی نظریہ ان پر لادا جا سکتا ہے۔ انھوں نے سخت قید و بند کے باوجود شعر کہنا شروع کیا۔ تمام نگرانیوں اور پاسبانیوں کے باوصف شعر کہتے رہے جب ان کے والد نے شدت اختیار کی تو بے ہوش ہو گئے نبضیں ڈوبنے لگیں۔ ان کے والد نے امتحان لیا دو شعر پڑھے اور اس کی تشریح چاہی۔ جوشؔ نے ان اشعار کی تنقیدی تشریح پیش کر دی اس امتحان میں کامیابی کے بعد انہیں شعر کہنے کی اجازت دی گئی مگر یہ تاکید رہی کہ زیادہ اس طرف رجحان نہ رہے[1] میرے خیال میں اتنی سختیوں کے بعد اور اتنی احتیاطوں کے ساتھ کسی بھی شاعر کو شعر گوئی کی اجازت نہیں ملی ہوگی۔

جدید نظم کا سب سے بڑا وصف منظر نگاری ہے اور یوں تو اردو نظم میں منظر نگاری کا رجحان ابتدا سے رہا ہے جسے نظیرؔ، انیسؔ، اقبالؔ، چکبستؔ سیمابؔ، اختر شیرانی، اسرار الحق مجاز، جوش ملیح آبادی، شوق قدوائی وغیرہ نے مزید تقویت بخشی ہے۔ منظر نگاری اسے انگریزی میں TREATMENT OF NATURE سے تعبیر کیا جاتا ہے۔[2] اردو میں جدید شاعری کے

---

[1] یادوں کی برات ص ۹۸ و ۹۹

[2] AN INTRODUCTION TO THE STUDY OF LITERATURE, BY HUDSON, PAGE 426

زیرِ اثر آتی ہے۔ جیسا کہ خواجہ الطاف حسین حالیؔ قلم طراز ہیں :۔

" اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج کل جو نیچرل شاعری کا لفظ اکثر لوگوں کی زبان پر جاری ہے اس کی کسی قدر شرح کی جائے۔ بعض حضرات تو نیچرل شاعری اس شاعری کو کہتے ہیں جو نیچریوں سے منسوب ہو یا جس میں نیچرل کے مذہبی خیالات کا بیان ہو۔ بعضے یہ خیال کرتے ہیں کہ نیچرل شاعری وہ ہے جس میں خاص مسلمانوں کی یا مطلقاً کسی قوم کی ترقی یا تنزّلی کا ذکر کیا جائے۔ مگر نیچرل شاعری سے یہ دونوں معنی کچھ علاقہ نہیں رکھتے ہیں۔ نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً و معناً دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت یا عادت کے موافق ہو۔" [۵]

منظر نگاری کی تعریف کے متعلق دنیا کے ادب میں مختلف نظریے ملتے ہیں۔ انگریزی، فارسی، عربی اور ہندی وغیرہ میں اسے برتا گیا ہے۔ راقم السطور کے خیال میں شمس العلماء مولوی امداد امام اثرؔ کا نقطۂ نظر منظر نگاری کے ذیل میں زیادہ واضح ہے جس سے اس کی وسعتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ :

" شاعری دو قسم پر تقسیم پاتی ہے۔ یعنی شاعری متعلق عالم خارج جسے بزبانِ انگریزی آبجیکٹو (OBJECTIVE) کہتے ہیں۔ اول قسم کی شاعری جس کا نام راقم خارجی رکھتا ہے۔ ایسے بیانات پر مشتمل ہے، جن سے عالم فی الخارج کے معاملات پیش نظر ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی شاعری میں اکثر بیانات، رزم، بزم، جلوس، تزک، احتشام، بساتین، باغ، تصور، چمن، گلزار، سبزہ زار، لالہ زار، چشمے، ہوا، برق، باراں، سیل، برف، شفق، بحر، شام، روز، شب، شمس، قمر، سیارے، ثوابت، قطب،

---

[۵] مقدمہ شعر و شاعری ص ۱۰۲ او ۱۰۵

بروح و دیگر خارجی اشیاء کے متعلق ہوتے ہیں" [1]

جوش خارجی اشیاء کی منظر کشی میں ان تمام التزامات کو مدنظر رکھتے ہیں جو حسیاتی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ منظر نگاری میں وہ کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتے بلکہ جزئیات نگاری میں بھی دل کش کیفیات پیدا کر دینے میں کمال رکھتے ہیں۔ ان کی ایک نظم "جنگل کی شاہزادی" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

پیوست ہے جو دل میں وہ تیر کھینچتا ہوں
اک ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں
گاڑی میں گنگناتا مسرور جا رہا تھا
اجمیر کی طرف سے جے پور جا رہا تھا
تیزی سے جنگلوں میں یوں ریل جا رہی تھی
بیلی ستار اپنا گویا بجا رہی تھی
خورشید چھپ رہا تھا رنگیں پہاڑیوں میں
طاؤس پر سمیٹے بیٹھے تھے جھاڑیوں میں
تھیں رخصتی کرن سے سب وادیاں سنہری
ناگاہ چلتے چلتے جنگل میں ریل ٹھہری
کانٹوں پہ خوبصورت اک بالتری پڑی ہے
دیکھا کہ ایک لڑکی میدان میں کھڑی ہے
زاہد فریب، گل رخ، کافر دراز مژگاں
سیمیں بدن، پری رخ، نوخیز، حسن ساماں
خوش چشم، خوبصورت، خوش وضع، ماہ پیکر
نازک بدن، شکرلب، شیریں ادا، فسوں گر

---

[1] کاشف الحقائق ج اول۔ مولوی سید امداد امام اثر ص ۱، ۲

کافرادا، شگفتہ، گل پیرہن، سمن بُو
سروِ چمن، سہی قد، رنگین جمال، خوش رُو
گیسو کمند، مہ وش، کافور، فام قاتل
نظارہ سوز، دل کش، سرمست انجمِ محفل
ابروہلال، مے گوں، جاں بخش، روح پرور
نسریں بدن، پری رخ، سیمیں عذار، دلبر
آہو نگاہ، نورس، گلگوں، بہشت سیما
یاقوت لب، صدف گوں، شیریں، بلند بالا
غارت گرِ تحمل، دل سوز، دشمنِ جاں
پروردۂ مناظر، دوشیزۂ بیاباں
گلشن فروغ، کمسن، مخمور، ماہ پارا
"دلبر کہ در کفِ او موم است سنگِ خارا"
ہر بات ایک افسوں، ہر سانس ایک جادو
دشمن فریب مژگاں، یزداں شکار گیسو
صحرا کی زیب و زینت، فطرت کی نورِ دیدہ
برسات کے ملائم تاروں کی آفریدہ
چہرے پہ رنگِ تمکیں، آنکھوں میں بیقراری
ایمائے سلیقہ کوبی، فرمانِ بادہ خواری
لوہا تپانے والی جلووں کی ضو فشانی
سکتے بٹھانے والی اٹھتی ہوئی جوانی
ڈوبے ہوئے سب اعضا حسنِ مناسبت میں
پالی ہوئی گلوں کے آغوشِ تربیت میں
حسنِ ازل ہے غلطاں شاداب پنکھڑی میں
یا جان پڑ گئی ہے جنگل کی تازگی میں

حوریں ہزار دل سے قربان ہو گئی ہیں!
رنگینیاں سمٹ کر انسان ہو گئی ہیں

جوشؔ کی اس نظم میں منظر نگاری اپنے شباب پر ہے۔ ان کا قلم پروردۂ مناظر معلوم ہوتا ہے۔ جوشؔ کو ابتدا سے ہی فطری مناظر سے والہانہ عقیدت تھی انھوں نے اپنے وطن ملیح آباد میں آبادی سے دور ایک "قصرِ سحر" تعمیر ہی اس لیے کرایا تھا کہ وہ قدرت کے دل کش حسن اور فطرت کے جمیل مناظر سے لطف اندوز ہو سکیں۔ ان کی ایک نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں؛

چھوڑ کر انسان کو میں فطرت کا شیدا ہو گیا
خوبیٔ قسمت کہ فوراً ربط پیدا ہو گیا
میرا ہم دم، سبزہ زار و کوہ و صحرا ہو گیا
دوست میرا چشمۂ گلزار و دریا ہو گیا
مجھ کو حلقے میں تبسم نے لیا خورشید کے
شامِ غم رخصت ہوئی جلووں میں صبحِ عید کے

دوست یہ ایسے ہیں جو دھوکا نہیں دیتے کبھی
جھوٹ سے واقف نہیں ہے ان رفیقوں میں کوئی
وقت آتا ہے تو کھل جاتی ہے ہنس کر چاندنی
صبح ہوتے ہی چٹک جاتی ہیں کلیاں باغ کی
ان کے وعدے وقت پر ایفا نہ ہوں ممکن نہیں
کون سی وہ رات ہے جس کے سرے پر دن نہیں

لہریں ہنس ہنس کر عجب نغمے سناتی ہیں مجھے
ڈالیاں پھولوں کی جھک جھک کر بلاتی ہیں مجھے

شاخیں اپنے سایے میں پہروں بٹھاتی ہیں مجھے
ندیاں اپنے کناروں پر سلاتی ہیں مجھے
کوئی مجھ کو رنج ان احباب میں دیتا نہیں
اور اس خدمت کی قیمت بھی کوئی لیتا نہیں

دیکھتے ہیں مجھ کو پہروں خندہ پیشانی سے پھول
کس قدر مانوس ہیں آئینِ مہمانی سے پھول
ٹوٹ کر دامن میں آجاتے ہیں آسانی سے پھول
کرتے ہیں مسرور مجھ کو اپنی قربانی سے پھول
پھول کے مانند انسانو! تمہارا دل نہیں
میری خاطر جان بھی دینا انھیں مشکل نہیں

نقرئی چادر بچھاتا ہے مہ سیمیں بدن
چومتی ہے آکے پیشانی مری زرّیں کرن
دیکھ کر شاداب ہوتا ہے مجھے صحنِ چمن
کس قدر خوش ہوں کہ جنگل ہے مرا پیارا وطن
روزِ صحرا کی طرف جانا مرا دستور ہے
بستیوں میں ہوں مگر میری قرابت دور ہے[1]

جوشؔ فطرت کے پرستار ہیں۔ اس لیے اس کے ذرّے ذرّے سے انھیں پیار ہے۔ درج بالا بندوں میں انھوں نے انسان اور فطرت کا موازنہ پیش کیا ہے اور دونوں کی الفت، خلوص اور پیار کا انداز نظم کیا ہے۔ جوشؔ کہتے ہیں کہ جنگل اور گلشن میں ملنے والے پیار میں کوئی عیاری نہیں بلکہ خلوصِ دل کا مظہر ہے۔ جوشؔ کے مناظرِ قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ

---

[1] روحِ ادب

کرنے کا انداز نرالا ہے۔ وہ کھلی فضا میں دیکھتے ہیں۔ اور ہر ہر کیفیت کا اظہار کرتے ہیں ان کی ایک نظم "چڑیا" کے کچھ بند ملاحظہ ہوں۔ ؎

مہکتے ہوئے پھول کے پاس آؤ
لچکتی ہوئی شاخ پر بیٹھ جاؤ
ہوا میں کبھی اڑ کے بازو ہلاؤ
کبھی صاف چشمے میں غوطے لگاؤ

یوں ہی پیاری چڑیا ابھی اور گاؤ

پھدک کر ادھر سے اُدھر دوڑ جاؤ
چہک کر ادھر سے اُدھر پر ہلاؤ
جھمک کر کبھی شاخ پہ چہچہاؤ
اُچھل کر کبھی نہر پہ گنگناؤ

یوں ہی پیاری چڑیا ابھی اور گاؤ

کبھی برگِ تازہ کو منہ میں دباؤ
کبھی کنج میں بیٹھ کر پھڑپھڑاؤ
کبھی گھاس پر لوٹ کر دل لبھاؤ
کبھی جا کے بیلوں کو جھولا جھلاؤ

یوں ہی پیاری چڑیا ابھی اور گاؤ [1]

جوش کو منظر نگاری اور عکاسی میں ید طولیٰ حاصل ہے کوئی بڑے سے بڑا مصور برش سے ویسی منظر کشی نہیں پیش کر سکتا جیسی کہ جوش "قلم فکر" سے کھینچ دیتے ہیں، جس پر نقشِ مانی و بہزاد حیران و ششدر

---

[1] روحِ ادب

رہ جاتا ہے۔ ان کی ایک نظم "کسان" کے چند اشعار پیش ہیں:

جھٹپٹے کا نرم رو دریا شفق کا اضطراب
کھیتیاں، میدان، خاموشی، غروبِ آفتاب
دشت کے کامِ دہن کو، دن کی تلخی سے فراغ
دور، دریا کے کنارے دھندلے دھندلے سے چراغ
زیرِ لب ارض و سما میں باہمی گفت و شنود
مشعلِ گردوں کے بجھ جانے سے ایک ہلکا سا دود
وسعتیں میدان کی سورج کے چھپ جانے سے تنگ
سبزۂ افسردہ پر خواب آفریں ہلکا سا رنگ
خامشی اور خامشی میں سنسناہٹ کی صدا
شام کی خنکی سے گویا دن کی گرمی کا گلا
اپنے دامن کو برابر قطع سا کرتا ہوا
تیرگی میں کھیتیوں کے درمیاں کا فاصلہ
خار و خس پر ایک دردانگیز افسانے کی شان
بامِ گردوں پر کسی کے روٹھ کے جانے کی شان
دوب کی خوشبو میں شبنم کی نمی سے اک سرور
چرخ پہ بادل، زمیں پر تتلیاں، سر پر طیور
پارہ پارہ ابر، سرخی، سرخیوں میں کچھ دھواں
بھولی بھٹکی سی زمیں، کھویا ہوا سا آسماں
پتیاں مخمور، کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی
نرم جاں پودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی

جوشؔ کی منظر نگاری کی یہ سب سے منفرد صفت ہے جہاں وہ ہر چیز

نذرِ اردو

کو متحرک کر دیتے ہیں۔ وہ منظر کشی میں دُوب کی خوشبو اور شبنم کی نمی کا بھی بھرپور احساس کرا دیتے ہیں۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ واقعی سامنے وہ منظر ہے جس میں پتیاں مخمور ہیں اور کلیاں آنکھیں جھپکا رہی ہیں۔ اس طرح کی منظر کشی کی مثالیں سوائے انیس کے اردو شاعری میں کسی نے نہیں پیش کی ہیں۔ بقول پروفیسر محمد حسن:

" فطری مناظر کی جو پُر کیف اور پُر جوش عکاسی ان کے یہاں ملتی ہے اس کی نظیریں ہمارے ادب میں بہت کم ہیں۔ فطرت ان کے ہاں سادہ ورق نہیں بلکہ بولتی گاتی ہوئی حقیقت ہے جو رموز و نکات کھولتی چلی جاتی ہے۔ جذبات کو جگاتی ہے۔ خیالات کو جنم دیتی ہے۔ افکار و احساس کے نہ جانے کتنے گل ہائے شگفتہ کو کھلاتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ فطرت منفی وجود نہیں ہے جسے بیدار کرنے کے لیے انسانی کاوش و جستجو، عمل اور جد و جہد کی ضرورت ہو جوش کے ہاں فطرت ایک مثبت وجود ہے۔ جو اضافی نہیں، محتاجِ نظر بھی نہیں ہے، مگر اس کے گرم لمس اور حیات آفریں نفس میں وہ شادابی ہے جو مردوں میں، ہیجان، جذبات میں طوفان بپا کر دے اور اہلِ نظر کو ثبوتِ حق بہم پہنچائے "۔ [۵۱]

جوش قدرتی مناظر کے عاشق ہیں ان کے دل میں قدرتی مناظر کی ہلکی چٹکیاں بھی لیتے ہیں اور گدگداتے بھی ہیں وہ فطرت سے ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔ بقول جعفر علی خاں اثر لکھنوی:

" جوش فطرت کے شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں آبشاروں کا جوش و خروش، ترنم ہے۔ دریا کی روانی، موجوں کا تلاطم اور بادِ سحری کی نرمی و سبک خرامی ہے ان کی شاعری میں وہی بے ترتیبی میں ترتیب اور تنوع میں ہم آہنگی ہے۔

---

۵۱ شناسا چہرے پروفیسر محمد حسن ص ۲۸، ۲۹

جو فطرت کا طرۂ امتیاز ہے۔" لہ

(۳)

اردو میں رومانی تحریک نے بہت سے موضوعات عطا کیے اور ان موضوعات کو تنوع بھی بخشا۔ نتیجہ کے طور پر اب اردو میں لفظ "رومان" کسی بندھے ٹکے مفہوم اور مطلب کا اسیر نہیں رہا بلکہ مزاج انسانی کی مختلف نوعیتیں اس لفظ کے ذیل میں آجاتی ہیں۔ اس لفظ کی وسعتیں محدود نہیں لیکن اس کا تعلق جذبات سے ہے۔ واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کے ذیل میں خواہ کتنے ہی اختلاف نظریات کیوں نہ ہوں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان سب کا محرک "جذبہ" ہی ہے۔ جوش کے یہاں یہ جذبہ مایوسی اور حرماں نصیبی کا ترجمان نہیں بلکہ جوش و ولولہ، عزم، حوصلہ اور قوت عمل کا نقیب ہے۔ بقول پروفیسر محمد حسن:

• جوش جمالیات اور تلاش حسن سے زیادہ شدت جذبات کے پرستار ہیں ان کی رومانیت کی عام شکل مبہم افسردگی، نسوانیت پرستی اور مادرائیت نہیں بلکہ گھن گرج، انقلابی آن بان اور پہاڑوں سے ٹکرا جانے والے ولولے کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔ بہر حال جوش نے اپنے فن میں بنیادی نغمہ جذبات کو قرار دیا۔ تعمق فکر کو نہیں ان کے یہاں فلسفیانہ عمق نہیں اگر کہیں فلسفیانہ خیالات آئے ہیں تو وہ بھی جذبات کے سانچوں میں ڈھل کر آئے ہیں۔ ہر سچے رومانوی ادیب کی طرح وہ بھی فرد کی عظمت کے قائل ہیں۔" ۵۲

یہ صحیح ہے کہ جوش کے یہاں فلسفیانہ عمق نہیں مگر وہ فرد کی رفعت میں یقین رکھتے ہیں۔ انھوں نے مزدور، محنت کش، کسان،

لہ اثر کے تنقیدی مضامین۔ جعفر علی خاں اثر لکھنوی ص ۲۸ و ۲۹

۵۲ اردو ادب میں رومانوی تحریک پروفیسر محمد حسن ص ۶۲

اور غلام ہندوستان میں بھی بسنے والوں کی جرأت کو للکارا، قوتِ احساس اور جرأتِ اظہار بیدار کی۔ شدتِ جذبات جوش کی نظم نگاری کی روح ہے۔ سماجی پستی، جور و ظلم اور جبر و تشدد کے خلاف اظہار وہ اس بیباکی سے کرتے ہیں کہ ان کے سامنے قصرِ شاہی اور جلالِ شاہی کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔ ان کا قلم گردنِ جبر و استبداد پہ مانندِ شمشیر چلتا ہے شہنشاہوں کے چترِ زر کو نوکِ قلم سے گرا دیتے ہیں۔ جوش کی نگاہ میں حق بجانب "کاشتکار" صحیح معنوں میں ارتقا کا پیشوا اور تہذیب کا پروردگار ہے۔ امراء و سلاطین نہیں ان کی نظم "کسان" کے چند اشعار پیش ہیں:

یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار
طفلِ باراں، تاجدارِ خاک، امیرِ بوستاں
ماہرِ آئینِ قدرت، ناظمِ بزمِ جہاں
ناظرِ گل، پاسبانِ رنگ و بو، گلشن پناہ
نازپرور لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ
جس کی جاں کاہی سے ٹپکاتی ہے امرت نبض تاک
جس کے دم سے لالہ و گل بن کے اتراتی ہے خاک
سازِ دولت کو عطا کرتی ہے نغمے جس کی آہ
مانگتا ہے بھیک تابانی کی جس سے روئے شاہ
خون جس کا دوڑتا ہے نبضِ استقلال میں
لوچ بھر دیتا ہے جو شہزادیوں کی چال میں
جس کے ماتھے کے پسینے سے پئے عز و وقار
کرتی ہے دریوزۂ تابش کلاہِ تاجدار
سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی
جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی

جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ
جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدّن کا چراغ
جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار
جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرورِ شہریار
دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں
کھیت سے پھیرے ہوئے منہ گھر کی جانب ہے رواں
ٹوکرا سر پر، بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی، دوش پر مضبوط ہل

اب جوش نے کسان کے "ہل" کی طرف رخ موڑ دیا ہے۔ وہ غیر ذی روح اشیاء کو بھی روح پھونک دیتے ہیں ملاحظہ ہو ؎

کون ہل! ظلمت شکن قندیلِ بزمِ آب و گل
قصرِ گلشن کا دریچہ سینۂ گیتی کا دل
خوش نما شہروں کا بانی رازِ فطرت کا سراغ
خاندانِ تیغ جوہردار کا چشم و چراغ
دھار پر جس کی چمن پرور شگوفوں کا نظام
شام زیر ارض کو صبحِ درخشاں کا پیام
ڈوبتا ہے خاک میں جو روح دوڑاتا ہوا
مضمحل ذروں کی موسیقی کو چونکاتا ہوا
جس کے چھو جاتے ہی مثلِ نازنینِ مہ جبیں
کروٹوں پہ کروٹیں لیتی ہے لیلائے زمیں
پردہ ہائے خواب ہو جاتے ہیں جس سے چاک چاک
مسکرا کر اپنی چادر کو ہٹا دیتی ہے خاک

جس کی تابش میں درخشانی ہلالِ عید کی
خاک کے مایوس مطلع پر کرن امید کی
جس کا مَس خاشاک میں بُنتا ہے اک چادر حسین
جس کا لوہا مان کر سونا اگلتی ہے زمین

یہاں تک تو "کسان" کا تعارف اور "ہل" کی عظمت کا بیان تھا اب جوشؔ کا قلم اسی سچے جذباتی انداز سے استخراجِ نتائج کے لیے مائل ہوتا ہے جس سے رقت طاری ہو جاتی ہے :

ہل پہ دہقاں کے چمکتی ہیں شفق کی سرخیاں
اور دہقاں سر جھکائے گھر کی جانب ہے رواں
اُس سیاسی رتھ کے پہیوں پر جمائے ہے نظر
جس میں آ جاتی ہے تیزی کھیتیوں کو روند کر
اپنی دولت کو، جگر پر تیرِ غم کھاتے ہوئے
دیکھتا ہے ملکِ دشمن کی طرف جاتے ہوئے
قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیٔ حرماں سے راہ
فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پر ہے نگاہ
پھر رہا ہے خوں چکاں آنکھوں کے نیچے بار بار
گھر کی نا امید دیوی کا شبابِ سوگوار
سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا
بے ردا بیوی کا سر، بچوں کا منہ اترا ہوا
سیم و زر، نان و نمک، آب و غذا کچھ بھی نہیں
گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں

ایک دل اور یہ ہجوم سوگواری ہائے ہائے
یہ ستم اے سنگ دل سرمایہ داری ہائے ہائے
تیری آنکھوں میں ہیں غلطاں وہ شقاوت کے شرار
جن کے آگے خنجرِ چنگیز کی مڑتی ہے دھار
بےکسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہات
کیا چبا ڈالے گی او کمبخت ساری کائنات
ظلم اور اتنا! کوئی حد بھی ہے اس طوفان کی
بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی
دیکھ کر تیرے ستم، اے حامئ امن و اماں
گُرگ رہ جاتے ہیں دانتوں میں دبا کر انگلیاں
اِدّعائے پیروئ دین و ایماں، اور تو
دیکھ اپنی کہنیاں جن سے ٹپکتا ہے لہو
ہاں سنبھل جا، اب کہ زہرے اہلِ دل کے آب ہیں
کتنے طوفاں تیری کشتی کے لیے بیتاب ہیں[1]

آخری حصۂ نظم میں جوشؔ نے اپنے مخصوص فطری انداز میں سرمایہ داری پر ضرب کاری لگائی ہے اور کاشتکاری کی عسرت و فلاکت کا واحد ذمہ دار سرمایہ دارانہ نظام کو قرار دیا ہے۔ جس نے قوم و ملک کی معیشت کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ لیکن دوسرے شعرا کی طرح وہ مایوسی کا شکار نہیں اور نہ ناکامیوں کا رونا روتے ہیں بلکہ تہدید یہ انداز میں کہتے ہیں کہ اے سرمایہ دار! اب سنبھل جا اب

---

[1] شعلہ و شبنم

تری کشتی کو ڈبونے کے لیے بہت سے طوفان تیار ہو گئے ہیں۔

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں جوشؔ کا بہت اہم حصہ رہا ہے انہوں نے ٹوٹے دلوں کو بلند حوصلگی اور مردہ طبیعتوں کو مژدۂ حیات افزا دیا۔ اکثر و بیشتر ان کی نظموں کا رجحان ملک گیر نہیں بلکہ عالم گیر ہو جاتا ہے۔ وہ کسی کو تشنہ لبو کا نہیں دیکھنا چاہتے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ وہ شدتِ جذبات کی فراوانی میں اکثر تلخ نوائی تک اتر آتے ہیں۔ لیکن یہ تلخی تھوڑی بہت ردّ و کد کے بعد اصلاح کار ثابت ہوتی ہے۔ ہلاکت بار نہیں۔ بقول پروفیسر اعجاز حسین:

" وہ اپنے کلام سے دنیا کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اقبال کی طرح حسنِ عمل کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور دنیا کو غلامی سے نجات دلا کر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی تعلیم دیتے ہیں، مگر بعض اوقات لوگوں کی برائیوں پر روشنی ڈالنے میں اتنے جوش اور تیزی سے کام لیتے ہیں کہ نظروں میں خیرگی پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی شیریں کلامی تلخ نوائی میں بدل جاتی ہے۔ خواہ اسے ان کے شدید احساسات پر محمول کیجیے یا خوابِ گراں سے چونکانے کی تدبیر سمجھیے۔"[1]

جوشؔ اپنی نظموں میں حق نوائی سے کام لیتے ہیں، وہ کسی مروت کی وجہ سے حقائق پر پردہ نہیں ڈالتے بلکہ بڑی سختی سے اور ذہانت سے نشان دہی کرتے ہیں۔ وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ انجام کار انھیں کس حد تک بھگتنا پڑے گا۔ اس کے لیے وہ ہر لحظہ تیار رہتے ہیں، وہ اپنے جذبات و احساسات کا گلا نہیں گھوٹتے چاہے وہ انگریزوں کی عمل داری

---

[1] تاریخ ادب اردو ڈاکٹر اعجاز حسین ص ۱۸۰

ہو، نواب حیدر آباد کا دربار ہو یا مہاراجہ دھول پور کی پیش کش۔ جوش کی نظموں کے کچھ حصے ملاحظہ ہوں:۔

"ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام"۔ ؎

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو
جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر بھیڑیا ہے بھیڑیا
بھیڑیے کو مار دو گولی پڑے امن و بقا
ہاتھ ہے ہٹلر کا رخشِ خودسری کی باگ پر
تیغ کا پانی چھڑک دو جرمنی کی آگ پر
سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمہاری اور یہ ذکر
نوعِ انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر
جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے
نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے
ہندیوں کے جسم میں کیا روحِ آزادی نہ تھی
سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی
اپنے ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے
کمپنی کا پھر وہ دورِ مجرمانہ یاد ہے
لوٹتے پھرتے تھے جب تم کارواں در کارواں
سربرہنہ پھر رہی تھی دولتِ ہندوستاں
دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم
سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم

؎ شعلہ و شبنم

صنعتِ ہندوستاں پر موت تھی چھائی ہوئی
موت بھی کیسی؟ تمہارے ہاتھ کی لائی ہوئی
اللہ اللہ کس قدر انصاف کے طالب ہو آج
میر جعفر کی قسم کیا دشمنِ حق تھا سراج؟
کیا اودھ کی بیگموں کو بھی ستانا یاد ہے؟
یاد ہے جھانسی کی رانی کا زمانہ یاد ہے؟
ہجرتِ سلطانِ دہلی کا سماں بھی یاد ہے؟
شیر دل ٹیپو کی خونیں داستاں بھی یاد ہے؟
تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے
کس کے تم لائے تھے سر شاہِ ظفر کے سامنے؟
یاد تو ہو گی وہ مٹیا برج کی بھی داستاں؟
اب بھی جس کی خاک سے اٹھتا ہے رہ رہ کے دھواں
تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہوگا بارہا؟
آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا
سچ کہو کیا حافظے میں ہے وہ ظلمِ بے پناہ؟
آج تک رنگون میں اک قبر ہے جس کی گواہ
ذہن میں ہوگا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی؟
یاد تو ہوگا تمہیں جلیانوالا باغ بھی
پوچھ لو اس سے تمہارا نام کیوں تابندہ ہے؟
"ڈائرِ" گرگِ دہن آلود اب بھی زندہ ہے
وہ بھگت سنگھ اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے
اس کی گردن میں جو ڈالا تھا وہ پھندا یاد ہے؟
اہلِ آزادی رہا کرتے تھے کس ہنجار سے؟
پوچھ لو یہ قید خانوں کے در و دیوار سے

اب بھی ہے محفوظ جن میں طنطنہ سرکار کا
آج بھی گونجی ہوئی ہے جن کے کوڑوں کی صدا
آج کشتیِ امن کے امواج پہ کھیتے ہو تم
سخت حیراں ہوں کہ اب کیوں درسِ حق دیتے ہو تم
اہلِ قوت دامِ حق میں تو کبھی آتے نہیں
"بینکی" اخلاق کو خطرے میں بھی لاتے نہیں
لیکن آج اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم
ہو نہ ہو اپنے میں اب قوت نہیں پاتے ہو تم
اہلِ حق روشن نظر ہیں، اہلِ باطل کور ہیں
یہ تو ہیں اقوال ان قوموں کے جو کمزور ہیں
آج شاید منزلِ قوت میں تم رہتے نہیں
جس کی لاٹھی اس کی بھینس اب کس لیے کہتے نہیں
کیا کہا انصاف ہے انساں کا فرضِ اولیں
کیا فسادِ ظلم کا اب تم میں کس باقی نہیں
دیر سے بیٹھے ہو نخلِ راستی کی چھاؤں میں
کیا خدا ناکردہ کچھ موچ آگئی ہے پاؤں میں
گونج ٹاپوں کی نہ آبادی نہ ویرانے میں ہے
خیر تو ہے اسپِ تازی کیا شفاخانے میں ہے
آج کل تو ہر نظر میں رحم کا انداز ہے
کچھ طبیعت کیا نصیبِ دشمناں ناساز ہے؟
سانس کیا اکھڑی کہ حق کے نام پر مرنے لگے
نوعِ انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے
ظلم بھولے راگنی انصاف کی گانے لگے
لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلّانے لگے؟

مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شور و شین
کل یزید و شمر تھے اور آج بنتے ہو حسینؓ
خیر اے سوداگرو اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی
وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں

جوشؔ کی نظم "مہاجن اور مفلس" بھی اسی قبیل کی ہے جس میں وہ "مہاجن" کی اصل حیثیت گدائی کو بیان کرتے ہوئے ایسا طنز کرتے ہیں کہ اس کی تلخی تا دیر قائم رہتی ہے۔ مہاجن کے لباس وضع قطع سے اس کی فطرت کے لازمی تقاضوں کو بڑی خوبصورتی سے ہم آہنگ بنا دیتے ہیں:

"مہاجن"

قد کی لمبائی سے اک حد تک کمر جھولی ہوئی
سر پہ چٹیا، مردہ چوہے کی طرح پھولی ہوئی
دانت میلے، پنڈلیاں پیچیدہ، دھوتی داغ دار
ناک میں مونچھوں کے گوشے، پیٹ میں توندی کا غار
سامنے غلے کے بورے، پشت پر الماریاں
بھنبھوڑیں میں کروٹیں لیتی ہوئی زرداریاں
کہنیاں تکیے کے اندروزن سے دھنستی ہوئی
چیت صدری اداڑے پر توند کے کھنچتی ہوئی

خوب ملے کرڈکاریں، دل کو بہلاتا ہوا
دونوں نتھنوں کو کھلائے توند سہلاتا ہوا
ہلنس کے غوطے، آبِ سرد و گرم میں دیتا ہوا
قرض کے طالب کے دل کا امتحاں لیتا ہوا
عذر کرتا پے بہ پے، تیوری چڑھاتا، بار بار
شدتِ حاجت کا اندازہ لگاتا بار بار
کشتیٔ ہستی کو جوئے سیم میں کھیتا ہوا
اُلٹی سانسیں، فربہی کے بارسے لیتا ہوا
رخ کی تاریکی پہ زر کی سرخیاں چھائی ہوئی
بے حقیقت خاک سونا بن کے اترائی ہوئی
کان کے بالے نمودِ زر کا دم بھرتے ہوئے
سود کے بارے میں کچھ سرگوشیاں کرتے ہوئے
عالمِ اخلاق کو زیر و زبر کرتا ہوا
بے زری کی شام سے اخذِ سحر کرتا ہوا

"مفلس"

ضعف سے آنکھوں کے نیچے تتلیاں پھرتی ہوئی
اوجِ خودداری سے دل پر بجلیاں گرتی ہوئی
لاش کاندھے پہ خود اپنے جذبۂ تکریم کی
ملتجی چہرے پہ لہریں سی امید و بیم کی
عزتِ اجداد کے سر پہ دمادم ٹھوکریں
رشتۂ الفاظ پہ لفظوں کی پیہم ٹھوکریں
چہرۂ افسردہ پر ٹھنڈا پسینہ شرم کا
سست نبضیں، بھیک کا لہجے کے اندر ٹھیکرا

قرض کی درخواست کی الجھی ہوئی تقریر میں
کپکپی اعصاب کی، بے چین دل کی [illegible]
اک طرف حاجت کی شدت اک طرف غیرت کا جوش
نطق پہ حرفِ تمنا، دل میں غصے کا خروش
جنبشِ مژگاں کے زیرِ سایہ، ناداری کی رات
جوہرِ انسانیت جوڑے ہوئے آنکھوں میں ہاتھ
سانس دہشت سے زمیں کی آسماں روکے ہوئے
مفلسی مردانہ لہجے کی عناں روکے ہوئے
لب کی خشکی، رخ پہ زردی، آنکھ شرمائی ہوئی
چشم و ابرو میں خودی کی آگ کجلائی ہوئی
نفس میں شیرانہ تیور، آرزو رو بہ مزاج
احتیاج و احتیاج و احتیاج و احتیاج

جوش کی ان نظموں میں غلاموں، آقاؤں، مفلسوں، اور سرمایہ داروں کی سچی تصویر کشی ملتی ہے۔ وہ صدائے انقلاب بلند کرتے ہیں۔ اور اس صدائے انقلاب میں توانائی پیدا کرنے کے لیے جہاں وہ ظالم و سفاک قوتوں کو للکارتے ہیں، وہیں مظلوموں اور مجبوروں کو بیدار بھی کرتے ہیں، مگر خود میدان میں نہیں آتے۔ بلکہ ایک فضا اور ماحول بناتے ہیں۔ وہ سیاسی رکتے پہیوں پہ تو نظر رکھتے ہیں لیکن سیاسی نظریات کے نشیب و فراز سے باخبر نہیں اور بنیادی طور پر وہ کسی سیاسی نظریے کے حامل بھی نہیں۔ بلکہ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ :

بھوکوں کا ہوا خواہ جسے خود بھی نہ کھائے
گرداب زدوں کا دوست کشتی نہ چلائے
اس منطق بے ہودہ کے کیا معنی ہیں؟
گھوڑوں کا ہوا خواہ بھی گھوڑا بن جائے

جوشؔ مفلسوں، بے کسوں، مزدوروں اور مجبوروں کے ہمدرد تو ضرور رہیں مگر وہ خود مفلس، بے کس، مزدور اور مجبور رہنا پسند نہیں کرتے اور اسے بے ہودہ منطق قرار دیتے ہیں۔ یہ بھی ان کے مزاج کی رومانیت ہے جو ان کی نظموں میں ڈھل گئی ہے۔

جوشؔ کی عشقیہ نظموں میں بھی ان کے مزاج کی رومانیت بدرجۂ اتم موجود ہے وہ اخترؔ شیرانی کی طرح لعنت گہِ ہستی سے دور جانا چاہتے ہیں جہاں نقشِ دوئی مٹ جائے اور جذبے کی پرستش ہی خلوص نیت والی عبادت قرار پائے۔ وہ بھی مسائلِ حیات پر غور کرتے ہیں لیکن "فکر اور جذبہ" کے اتصال سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہی ان کا نظریہ ٹھہرتا ہے جس پر شاعری سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے ان کی اس طرح کی نظموں میں "پروگرام" "بھٹکی ہوئی نیکی" "گنگا کے گھاٹ پر" "رقص" "خاتونِ مشرق" "فتنۂ خانقاہ" "جوانی کی رات" "کل رات تو" "انگیٹھی" "سہاگن بیوہ" "جمال و جلال" "جنگل کی شاہ زادی" "پہلی مفارقت" "ذاکر سے خطاب" "شام کا رومان" "برسات کی چاندنی" وغیرہ بڑی اہم ہیں۔ کچھ نظموں کے انتخابات ملاحظہ ہوں:

پروگرام

اے شخص! اگر جوشؔ کو تو ڈھونڈنا چاہے
وہ پچھلے پہر حلقۂ رنداں میں ملے گا!

اور صبح کو وہ ناظرِ نظارۂ قدرت
طرفِ چمن و صحنِ بیاباں میں ملے گا
اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرار و معانی
شہرِ ہنر و کوئے ادیباں میں ملے گا
اور شام کو وہ مردِ خدا، رندِ خرابات
رحمت کدۂ بادہ فروشاں میں ملے گا
اور رات کو وہ خلوتیِ کاکل و رخسار
بزمِ طرب و کوچۂ خوباں میں ملے گا
اور ہوگا کوئی جبر تو وہ بندۂ مجبور
مردے کی طرح خانۂ ویراں میں ملے گا

"گنگا کے گھاٹ پر"

بڑھائے سرخیٔ عارض ہوائے صحرا سے
نہا کے کون چلا آ رہا ہے گنگا سے
ہرا دھلائی کا سر پر نظر جھکائے ہوئے
دبائے دانتوں میں آنچل بدن چرائے ہوئے
لبوں پہ مہرِ خموشی، خموشیوں میں خطاب
کمر میں لوچ، جبیں پر دمک، نظر میں شراب
شرابِ ناب لیے نرگسی کٹوروں میں
لہو چمن کا رواں سرخ سرخ ڈوروں میں
دراز زلف میں جادو، سیاہ آنکھ میں مدھ
نسیمِ صبحِ بنارس، ہلالِ شامِ اودھ

عجیب حسن ٹپکتا ہے چشم و ابرو سے
مہک رہا ہے بدن کم سنی کی خوشبو سے
نمی ہے زلف میں، اشنان کر کے نکلی ہے
یہ کس کی موت کا سامان کر کے نکلی ہے
سیاہ زلف پہ آنچل خفیف آبی ہے
برہنہ پا ہے تو ہر نقشِ پا گلابی ہے
مری طرف سے کوئی کاش یوں ہو گرمِ خطاب
کہ وقتِ صبح ہے اے دخترِ شبِ مہتاب
ازل کے دن سے درِ حسن کا بھکاری ہوں
ادھر بھی ایک نظر میں ترا پجاری ہوں

"کہستان دکن کی عورتیں"

یہ اُبلتی عورتیں اس چلچلاتی دھوپ میں
سنگِ اسود کی چٹانیں، آدمی کے روپ میں
واہ کیا کہنا ترا، اے حسنِ ارض آفتاب
یہ برشتہ رنگ یہ تپتے ہوئے رنگیں شباب
ہر سراپا، بت تراشوں کی عرق ریزی کا کھیل
اتنی بے پایاں صلابت پہ بھی ہر نقشہ سجل
چال جیسے تند چشمے، تیوریاں جیسے غزال
عارضوں میں جامنوں کا رنگ آنکھیں بے مثال
عورتیں ہیں یا کہ ہیں برسات کی راتوں کے خواب
پھٹ پڑا ہے جن پہ طوفاں خیز پھرتیلا شباب

یہ جواں چہرے یہ چہرون پہ ہے برنائی کا جوش
تو ہے آہن میں کھودے ہیں کسی نے چشم و گوش
جسم ہیں کچھ اس قدر ٹھوس، الحفیظ و الاماں
لیجیے چٹکی تو چھل جائیں خود اپنی انگلیاں
مچھلیاں شانوں کی ابھری سی بڑی سی کاکلیں
آہن و فولاد کے پٹھے، سلاخوں کی رگیں
دید کے قابل ہے ان کافر بتوں کا رنگ روپ
کھیت چکی ہے جن میں بارش، ڈس چکی ہے جن کو دھوپ
ان بناتِ کوہ کی کڑیل جوانی، الاماں
پتھروں کا دودھ پی پی کر ہوئی ہیں جو جواں
کنکروں کے فرش پر دنیا سلاتی ہے جنھیں
آندھیوں کے پالنے میں نیند آتی ہے جنھیں
کیا خبر کتنے دلوں کی جوش پامالی ہوئی
ان اداؤں سے کہ طوفانوں کی ہیں پالی ہوئی

جوشؔ عشق سے زیادہ جذبۂ عشق میں یقین رکھتے ہیں یہ جذبہ انکی روح کو گرماتا ہے اور مہمیز کرتا ہے جس میں حسن کی رنگینیوں سے زیادہ حسن کی اداکاریاں ان کے دل کو برماتی ہیں بقول پروفیسر احتشام حسین :-
" شدتِ جذبات اور سریع الحسی نے جوشؔ میں بہت متضاد عناصر پیدا کردیے ہیں اور چونکہ وہ سب باتیں ان کی شاعری اور گفتگو میں نمایاں جگہ پا چکی ہیں اس لیے جوشؔ ان سے دست بردار بھی نہیں ہوتے۔ گو تفکر انھیں بچپن سے عزیز رہا ہے اور انھوں نے اسے سینے سے لگائے رکھا ہے لیکن ان کا ذہن طبعاً جذباتی ہے ۔ منطقی نہیں ہے ۔ ان کی منطق بھی جذبات

ہی کی گود میں پرورش پاتی ہے، مذہب، خدا، حیات، موت، جبر و اختیار، مقصدِ حیات، علم انسانی، عقل و عشق، جنون و حکمت، ان تمام مسائل پر انھوں نے غور کیا ہے اور حسین ترین شاعرانہ انداز میں ان کے نازک مقامات کو پیش کیا ہے، لیکن ہر مقام پر عقل و جذبہ کی آویزش اتنی شدید رہی ہے کہ مفکر جوش کو اکثر شکست دیدی ہے ...... کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جوش جذبہ کی والہانہ تندی اور شدت کی گرفت میں اس طرح آجاتے ہیں کہ ان کی شعوری کوششیں بھی اسی رنگ میں رنگ جاتی ہیں۔ اس میں ان کے خلوص یا ان کی صداقت پہ حرف نہیں آتا۔[1]

دراصل جوش کے شعری جذبے میں حسن، شباب اور انقلاب کی آمیزش ہے وہ اس آمیزش سے اپنے کو جدا نہیں رکھ سکتے اور جب یہ ان کا رومانی انداز فکر غالب آجاتا ہے ان کی ایک نظم "حسن اور مزدوری" اس کی واضح مثال پیش کرتی ہے انتخاب ملاحظہ ہو: -

"حسن اور مزدوری"

ایک دوشیزہ سڑک پر دھوپ میں ہے بے قرار
چوڑیاں بجتی ہیں کنکر کوٹنے میں بار بار
چوڑیوں کے ساز میں یہ سوز ہے کیسا بھرا
آنکھ میں آنسو بنی جاتی ہے جس کی ہر صدا
گرد ہے رخسار پر زلفیں اٹی ہیں خاک میں
نازکی بل کھا رہی ہے دیدۂ غمناک میں
دھوپ میں لہرا رہی ہے کاکلِ عنبر سرشت
ہو رہا ہے کمسنی کا لوچ جزوِ سنگ و خشت

---

[1] انتخاب جوش پروفیسر احتشام حسین ص ۲۶ و ۲۷

پی رہی ہیں سرخ کرنیں مہرِ آتش بار کی
نرگسی آنکھوں کا رس، مے چمپئی رخسار کی
چیتھڑوں میں دیدنی ہے روئے نمگیں پر شباب
ابر کے آوارہ ٹکڑوں میں ہو جیسے ماہتاب
اُف یہ ناداری مرے سینے سے اٹھتا ہے دھواں
آہ اے افلاس کے مارے ہوئے ہندوستاں
حسن ہو مجبور کنکر توڑنے کے واسطے
دستِ نازک اور پتھر توڑنے کے واسطے
آسمانِ جانِ طرب کو وقفِ رنجوری کرے
صنفِ نازک بھوک سے تنگ آ کے مزدوری کرے
اس جبیں پر اور پسینہ ہو جھلکنے کے لیے
جو جبینِ ناز ہو افشاں چھڑکنے کے لیے
بھیک میں وہ ہاتھ اٹھیں التجا کے واسطے
جن کو قدرت نے بنایا ہو حنا کے واسطے
نازکی سے جو اٹھا سکتی نہ ہو کاجل کا بار
ان سبک پلکوں پہ بیٹھے راہ کا بوجھل غبار
مفلسی چھانٹے اسے قہر و غضب کے واسطے
جس کا مکھڑا ہو شبستانِ طرب کے واسطے
نازنینوں کا ہے یہ عالم مادرِ ہند آہ آہ
کس کے جورِ ناروا نے کر دیا تجھ کو تباہ
اے خدا! ہندوستاں پہ یہ نحوست تا کجا؟
آخر اس جنت پہ دوزخ کی حکومت تا کجا؟

اس نظم میں جوشؔ نے منظرِ حسن اور شباب کا نقشہ پیش کرتے ہوئے انقلاب کے شعلوں کو بھی ہوا دی ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ دوشیزگی کا حسن اس لیے نہیں کہ وہ کنکر اور پتھر کوٹے۔ جوشؔ کی خاطرِ نازک پر بھی اس دلدوز منظر کو دیکھ کر غم کے بادل چھا جاتے ہیں اور وہ مفلسی و غربت کی تمام تر کیفیت کو خود اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں پھر اسی احساس سے وہ غریب، اور مزدور دوشیزہ کے حسن کو دیکھتے ہیں اور ظلم و جبر و تشدد کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔

جوشؔ کی بعض نظمیں محض ہنگامی اثرات سے مملو ہیں جس میں بلا کی خطابت ہے۔ خطابت کوئی بری چیز نہیں۔ پروفیسر کلیم الدین احمد جوشؔ کی نظموں میں خطابت شاعرانہ حدود میں تسلیم نہیں کرتے ہیں[1] تعجب ہے کہ وہ خطابت کے اصل مفہوم کو کسی دوسری طرح محسوس کرتے ہیں۔ خطابت ایک فن ہے اور فنی محسنات کی شمولیت سے ہی یہ فن بنتا ہے۔ خطابت صرف صدا لگانے یا نعرا دینے کا نام نہیں۔ اس کے مطالبات اور نزاکتیں ہیں۔ جملوں کا دروبست مضامین کی ترتیب، تراکیب کی بندش اور برمحل استعمال، لفظوں کی صوتی ہم آہنگی، مفہوم، معنی اور لفظی مناسبت اور اتار چڑھاؤ، ٹھہراؤ سے ہی خطابت کا فن پیدا کیا جا سکتا ہے۔ خیالات اور عنوان کی گہرائیوں میں ڈوب کر جب برمحل اور موزوں لفظوں میں کوئی بات کہی جاتی ہے تو خطابت کا لطف آتا ہے۔ خطابت کے لیے طرزِ بیان میں جدت بھی ضروری ہے اور جوشؔ کی تمام تر نظموں میں، خواہ وہ ہنگامی ہوں یا کسی مخصوص عنوان کے تحت لکھی گئی ہوں خطابت کا عنصر نمایاں طور پر ملتا ہے۔ وہ شاعرانہ اندازِ خطابت سے خوب واقف ہیں۔ چنانچہ تشبیہات و استعارات کے ساتھ تجنیسِ صوتی سے بھی

---

[1] اردو شاعری پر ایک نظر   پروفیسر کلیم الدین احمد   ص ۲۰۵

خوب دل کھول کر کام لیتے ہیں۔ انیس اور اقبال کے بعد جوش ہی ایک ایسے شاعر ہیں جو صنائع و بدائع سے کام لینے کے باوجود صنعتوں کے اسیر نہیں ہیں بلکہ ان کے استعمال سے صنعتوں کو معراج نصیب ہوتی ہے اور وہ اس خالقِ شعر و ادب کی رہین و ممنون نظر آتی ہیں۔

جوش 'مقامی تشبیہات' سے اپنے کلام میں اثر آفرینی پیدا کر دیتے ہیں اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان کو اپنے گرد و پیش کی فضا کو متاثر کرنا تھا اور انھیں سے داد و تحسین حاصل کرنا تھی وہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات اور اصطلاحات سے کام لیتے ہیں اور تشبیہاتی و استعاراتی زبان استعمال کرتے وقت اس بات کا خاص لحاظ رکھتے ہیں کہ وہ ان کے ماحول کی تراشی ہوئی ہو جس سے ان کی معنویت میں اضافہ ہو جائے۔ جوش استعاراتی معنی تشبیہاتی مفہوم اور محاکاتی اشاریہ سے ابلاغ و تفہیم کے لیے لسانی آہنگ پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں اور اس کی مدد سے فنِ خطابت کے حسن میں مزید اضافہ کر دیتے ہیں۔ اکثر و بیشتر وہ معنی کو مسخر کر لیتے ہیں یعنی لغت کے معنی سے مختلف وہ روز مرہ اور چلن کے معنی میں لفظوں کا استعمال روا رکھتے ہیں جس سے وہ استعارہ کو علامت اور علامت کو استعارہ کی شکل میں پیش کر دیتے ہیں وہ لفظ کے لغوی معنی میں گرفتار نہیں ہوتے بلکہ اشارہ و استعارہ کی مدد سے مافی الضمیر کو اس طرح پیش کر دیتے ہیں کہ وہ مصرعہ اور شعر کے لباس میں چلتے پھرتے مرقع معلوم ہوتے ہیں۔ جوش تشبیہات سے تناسب اور تقابل اس خوبی سے پیدا کر دیتے ہیں کہ استعارہ کی تخلیق ہو جاتی ہے جس سے نظم کے حسن میں چار چاند لگ جاتا ہے۔ بقول پروفیسر آل احمد سرور:

"جوش کی حسن کاری میں کلام نہیں، ان کی تشبیہات جاندار، دلکش اور معنی خیز ہوتی ہیں ان کا تخیل لالہ کار رہا ہے مگر دور رس نہیں..... انسانیت سے اس قدر گہری محبت اور اس کے روشن مستقبل

پر یقین محکم نے ان کے کلام میں بڑی آب و تاب پیدا کر دی ہے۔" [۱]

جوشؔ تشبیہات و استعارات سے جو خوبصورت زبان تخلیق کرتے ہیں، وہ انیسؔ اور اقبالؔ کے سوا کسی دوسرے شاعر کے حصے میں اب تک نہیں آسکی ہے کیونکہ انھوں نے انیسؔ اور اقبالؔ سے کسب نور کیا ہے پھر بھی جو لسانی ادراک اور آہنگ انیسؔ کے ہاں ہے وہ اقبالؔ کے ہاں نہیں، اور جوشؔ، اقبالؔ سے مختلف سحر کارانہ انداز بیان کا حامل ہے۔ بقول جعفر علی خاں اثر لکھنوی:

"جہاں تک زبان کی سحر کاریوں اور تشبیہات و استعارات اور اسالیب بیان کے نادر اور بر محل صرف کا تعلق ہے، جوشؔ، اقبالؔ سے بھی پیش پیش ہے۔" [۲]

اردو شاعری کے مکمل سرمایہ کا جائزہ لیتے ہوئے، جوشؔ کی تشبیہات و استعارات کے متعلق پروفیسر محمد حسن رقم طراز ہیں کہ:

"اردو شاعری کے پورے سرمائے میں شاید ہی کسی شاعر نے اتنی تشبیہیں، استعارے اور IMAGES استعمال کی ہوں پھر ان تشبیہوں میں ندرت اور تازگی ہے اور ان میں سے اکثر مشاہدے کے نہایت لطیف استعمال سے پیدا ہوتی ہیں ان تشبیہوں میں اکثر مرکب اور ہیں۔ یعنی ایک مرئی چیز کو دوسری مرئی چیز سے تشبیہ دینے کے بجائے جوشؔ نے حسیات اور کیفیات سے تشبیہیں دی ہیں اس کی نمائندہ مثالیں ان کی رباعیوں میں کثرت سے ملیں گی چہرے کی ملاحت کو کسوٹی پر سونے کے رنگ

---

[۱] ادب اور نظریہ — پروفیسر آل احمد سرور — ص ۲۰۲

[۲] اثر کے تنقیدی مضامین — جعفر علی خاں اثر لکھنوی — ص ...

سے تشبیہہ دینا یا آواز کی کھنک کو چینی پر اشرفی کی جھنکار کہنا بالکل نئی تشبیہیں
ہیں اسی طرح جوشؔ سے قبل IMAGES کو اتنے بڑے پیمانے پر ایک آدھ
کے سوا کسی شاعر نے استعمال نہیں کیا تھا۔ جوشؔ نے پورے تمدن کی بڑی
نازک اور نمایندہ زاویوں سے تصویر کھینچی ہے۔"[1]

جوشؔ کو الفاظ و بیان پر بڑی قدرت حاصل ہے اور لفظوں سے
پیکر تراشنے کا ہنر جانتے ہیں۔ غیر مرئی اشیاء کو بھی زندہ پیکر میں ڈھال دینا
ان کی قادرالکلامی اور لفظوں پر غیر معمولی قدرت کا کمال ہے۔ انھوں نے
اردو نظم میں "جامن والیوں" "لافانی حروف" اور "دیہاتی بازار" کو
جگہ دی ——

---

[1] شناسا چہرے — پروفیسر محمد حسن — ص ۷۰

تین

غزل گوئی

اس وقت کے رواج کے مطابق اور اردو شعرا کی روایت کے اعتبار سے جوش نے بھی اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی تھی لیکن ان کی غزلوں میں جہاں روایت کا بھرپور احترام ہے وہاں اپنی راہ خود نکالنے کی کوشش بھی نظر آتی ہے۔ وہ جدید رنگ تغزل کی بنیاد ڈالتے ہیں جس میں ان کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ شامل ہے۔ ان کی غزل میں حسن و عشق کی حکایات، پارینہ اور فرسودہ لوازمات نہیں ملتے بلکہ وہ اپنے تاثرات اور احساسات نظم کرتے ہیں وہ اسیرِ حسن نہیں ہوتے، بلکہ حقیقتِ حسن کا عرفان کراتے ہیں اس لیے عشق کو بلند سمجھتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر ہے کہ اگر عشق خریدارِ حسن نہ ہوتا تو حسن کی گرم بازاری ماند پڑ جاتی۔ غزلوں میں بھی وہ لفظوں کے استعمال تراکیب کی چستی اور بندش پر خصوصی توجہ فرماتے ہیں۔ فارسی اور عربی تراکیب کی بہتات ہے اس لیے سطحیت سے محفوظ رہتے ہیں لیکن ان کی زبان غزل جیسی صنفِ سخن کے لیے موزوں و مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات تو ان کی زبان میں ادا ہو جاتے ہیں مگر غزل کی زبان میں غزل کی بات جس طرح ادا ہونی چاہیے وہ نہیں ہو پاتی۔

جوش کے یہاں مضامین اور موضوعات کی کمی نہیں اس لیے ان کی غزل گوئی مضامین کے اعتبار سے کافی متنوع ہے۔ ظاہر ہے کہ نظموں جیسی تفصیل اور تشبیہات و استعارات کی غزلوں میں گنجائش نہیں۔ البتہ وہ خارجی پہلوؤں کو تو کسی حد تک نبھا لیتے ہیں مگر داخلیت کی کمی غزل میں کھٹکتی ہے۔ اس لیے ان کی غزل گوئی کبھی واقعہ نگاری کی مثال پیش

کرنے لگتی ہے۔ لیکن ایسی وارفتگی کی جس میں سرمستی اور وارفتگی اور والہانہ پن کی کیفیت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ بقول پروفیسر اعجاز حسین:

"جوش کی غزلیں سرمستی و کیفیت کا بیان ہیں۔ محبت کے واقعات کی تفصیل حسن کی کرشمہ سازیوں کی داستانیں نہایت خوبی سے اشعار میں جگہ پاتی ہیں چونکہ وہ خود راہِ محبت میں گم ہو چکے ہیں اس لیے جو کچھ بیان کرتے ہیں دل کی چوٹ ہوتی ہے، دماغ کی کاوش نہیں۔"[1]

جوش کی غزل میں بادۂ شبانہ کی سرمستیاں ہیں، لذتِ خواب سحر نہیں، بلکہ رنگینیٔ شام اور طلوع جام کا نشہ ملتا ہے اس لیے غزل میں بھی شوکتِ الفاظ سے کام لیتے ہیں۔ اگرچہ غزل میں شوکتِ الفاظ وہ تاثیر و کسک نہیں پیدا ہونے دیتی جو غزل کا خاصہ ہے۔

غزل میں اسلوب بیان کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ تغزل آسان چیز نہیں۔ صرف جمالیاتی احساس ہی تغزل پیدا کرنے کے لیے کافی نہیں ہوتا تغزل نے ہی حیاتِ انسانی کے جمالیاتی تقاضوں کی ترجمانی کی ہے۔ اور آسودگی بھی بخشی ہے۔ تغزل ہی وارداتِ قلبیہ اور امورِ ذہنیہ کے ساتھ اخلاقی، سماجی اور تہذیبی زندگیوں کو عنوان دیئے ہیں۔ جوش نے بھی اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی ہے اور غزل کے شدید مخالف اور نکتہ چین ہونے کے باوجود غزل اور اندازِ غزل سے دامن نہیں چھڑا سکے، آج بھی جوش کی زندگی کا اتار چڑھاؤ آئینہ غزل میں نظر آتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں جو ان کے جدید رنگ تغزل کا نمونہ ہیں:

اے کلی ناز سے کھل بادۂ سرجوش ابل
کہ نگارِ چمن و شاہدِ مستاں آیا

---

[1] تاریخ ادب اردو ڈاکٹر اعجاز حسین ص ۱۸۲

چلا ہے سوئے حرم دل سے ساز کرتا جا
طوافِ کعبۂ حسنِ مجاز کرتا جا
سکھا جمال کو ایفائے عہد کا دستور
جفائے طولِ شبِ انتظار کرتا جا

خود اپنا ذوقِ اسیری ہے پانو کی زنجیر
حضور آپ کی زلفوں کے خم کی بات نہیں

مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

دنیا نے فسانوں کو بخشی افسردہ حقائق کی تلخی
اور ہم نے حقائق کے نقشے میں رنگ بھرا افسانوں کا

میرا پیرہن نہیں چاک ابھی مجھے رحم کھا کے سنگھا بھی دے
یہ مہک جنوں کی بھری ہوئی ہے جو تیری زلفِ دراز میں

اے شوق مجھے گمراہ نہ کر کہ شورش کے اسباب نہیں
امید کے اجڑے گلشن میں اک پھول بھی اب شاداب نہیں

ہاں آسمان اپنی بلندی سے ہوشیار
اب سر اٹھا رہے ہیں کسی آستاں سے ہم

اے حسن اگر عشق خریدار نہ ہوتا
یہ غلغلۂ گرمیٔ بازار نہ ہوتا

انگڑائیاں لیتا کوئی اے جوشؔ دمِ صبح
خورشید کے ہر دست دگریبان نظر آیا

گزر رہا ہے ادھر سے تو مسکراتا جا
چراغِ مجلسِ روحانیاں جلاتا جا
ملا کے نظر سے نظر عزتِ سبو کی قسم
چراغِ محفلِ عقل و خرد بجھاتا جا
اسیر ہیں جو سیہ کاکلوں کے حلقے میں
کمندِ حلقۂ تنگ مایہ سے چھڑاتا جا

پنہاں تھیں جس میں روح کی گہری خموشیاں
اس جنبشِ نظر کو غزل خواں بنا دیا

وہ کون منظرِ قدرت ہے آج عالم میں
جو میرے واسطے آغوش وا نہیں کرتا
خدا کرے کبھی رندوں کے سامنے آئے
وہ شیخ جو ترکِ دنیا نہیں کرتا

سخن فروشیاں نہ کر جہانِ حسن و عشق میں
کہ یاں ہر ایک خال میں ہیں لاکھ نکتہ دانیاں
ذرا اثر نہ پڑ سکا جنونِ ذوقِ دید پر!
پیمبروں نے لاکھ کیں نظر کی پاسبانیاں

جہاں ہے شوق وہاں کیف و کم کی بات نہیں
دیارِ عشق میں دیر و حرم کی بات نہیں

سوزِ غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا

وہ زیبِ انجمن ہوا تو کوئی بولتا نہیں
معاشرانِ بزم کیا ہوئیں وہ گل فشانیاں
شبابِ رفتہ کے قدم کی چاپ سن رہا ہوں میں
ندیم! عہدِ شوق کی شائے جا کہانیاں

اللہ رے حسنِ دوست کی آئینہ داریاں
اہلِ نظر کو نقش بہ دیوار کر دیا
مجھ کو وہ بخشتے تھے دو عالم کی نعمتیں
میرے غرورِ عشق نے انکار کر دیا

یہ [illegible] رنگِ شکستہ ہے مری حسرتوں کا یہ خزانہ
یہ گلاب کی سی جو سرخیاں ہیں ترے تبسمِ ناز میں

اب دل کا سفینہ کیا ابھرے طوفاں کی ہوائیں ساکن ہیں
اب بحر سے کشتی کیا ابھرے موجوں میں کوئی گرداب نہیں

آج اے نوبنگاہِ قمر و بنتِ سحاب
کاش میرا سرِ شوریدہ ہو تیرا زانو
آج اے جوشِ نزے رنگِ غزل گوئی سے
قندپارس کا مزا ہے بزبانِ اردو

نہ جانے رات کو تھا کون زینتِ پہلو
مچل رہی تھی ہواؤں میں شراب کی خوشبو
اُدھر محیطِ فلک پر فسونِ نجم و قمر
اِدھر حریمِ تمنا میں نرگسِ جادو

جب فریبوں میں ہی رہنا ہے تو اے اہلِ خرد
لذتِ پیمانِ یارِ سست پیماں کیوں نہ ہو
ہاں جب آویزش ہی ٹھہری ہے تو ذرّے چھوڑ کر
آدمی خورشید سے دست و گریباں کیوں نہ ہو

انسان اور رہ نہ سکے خوش! اٹھا تو جام
نادان! تیرے دل کی کلی ہے شگفتنی
چھلکا چمن میں جام کہ یہ رَد بھی دیکھ لے
سبزے پہ اوس، اوس پہ ہے، ہے پہ چاندنی

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جوشؔ کی غزلوں میں فرسودہ مضامین کی گنجائش نہیں۔ وہ تخلیقی زبان و بیان سے کام لیتے ہیں۔ کسی تقلیدی انداز کو نہیں اپناتے۔ انھوں نے غزل کے رموز و نکات اور علامتوں کو برتا ہے۔ ان کی غزلوں میں قلب و ذہن دونوں کا سرمایہ ہے اور وہ حسن و عشق کی حدیث دلبری سے کبھی بیگانہ نہیں۔ جذبہ و تخئیل کے امتزاج سے غزلیت میں ایک نئی شان پیدا ہو گئی ہے۔ جوشؔ فنِ غزل کی تخلیقی آزادی پر ڈاکہ نہیں ڈالتے بلکہ اس کی امکانی وسعتوں کو سہارا دیتے ہیں۔ ان کے ہاں شاہد و شراب، زلف و گیسو، مے و مے خانہ اور شمع پروانہ جیسی علامتوں کی بھی الٹ پھیر نہیں۔ وہ جذباتی حقیقتوں کی بازآفرینی سے غزل کی زبان تخلیق کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اور شعور تغزل سے ابدی صداقتوں کو پیمانۂ غزل میں ڈھالتے ہیں۔ جوشؔ کی قدیم رنگ کی غزلوں سے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں:۔۔۔

وہ غریب دل کو سبق ملے کہ خوشی کے نام سے ڈر گیا
کبھی ہنس کے تم نے بھی بات کی تو ہمارا چہرا اتر گیا

تری راہ کا یہ اصول ہے کہ شکست مانے تو فتح ہو
جو چلا اکڑ کے وہ گر پڑا، جو جھکا لرز کے ابھر گیا

وہ شکارِ جلوۂ دہر تھے، میں ہلاکِ پرتوِ یار تھا
وہ سنور سنور کے بگڑ گئے، میں بگڑ بگڑ کے سنور گیا

یہ عجیب حسن کے رمز تھے، یہ نرالے ناز کے بھید تھے
وہ نقاب الٹ کے جو آ گیا، کوئی جی اٹھا کوئی مر گیا

مری فراست میں شیب آ کر اضافہ کچھ نہ کر سکے گا
کچھ ایسے پیچیدہ راستوں سے گزر رہا ہے شباب میرا

صبح کی کرنیں جگا ہی دیں گی خوابِ ناز سے
رات نے کلیوں کی دم بھر آنکھ جھپکائی تو کیا
اصل کی جانب جھکا دے گی زمانے کی ہوا
پنکھڑی بن کر چمن کی خاک اترائی تو کیا

یہ عجیب رنگ تھا مے کشو، کہ ہر ایک چہرے پہ نور تھا
یہ گماں ہے مجھ کو گزشتہ شب کوئی مست تم میں ضرور تھا
میں تڑپ کے حسن کو پا گیا وہ چمک کے خاک میں مل گیا
میں شہیدِ جلوۂ بے خودی، وہ ہلاکِ رنگِ شعور تھا
مرے سامنے تھا وہ جلوہ گر اسے پا سکی نہ مری نظر
یہ ضیائے کثرتِ جلوہ تھی، یہ ہجومِ شانِ ظہور تھا
یہ صبا نے خاک اڑائی کیوں یہ چٹک کے غنچے نے کیا کہا
مجھے وہم ہوتا ہے ہم نوا، کوئی بھید اس میں ضرور تھا

ثبوت یہ ہے محبت کی سادہ لوحی کا
جب اس نے وعدہ کیا، ہم نے اعتبار کیا

سحر ہوئی مسکرا رہا ہے، ہر اک ستارے میں نور تیرا
گلوں میں تیری شگفتگی ہے صبا میں جوشِ سرور تیرا

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلالِ روزِ حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا
صبا تصدق ترے نفس پر چمن ترے پیرہن پہ قرباں
شمیم دوشیزگی میں کیسا بسا ہوا ہے شباب تیرا

کرے گا دونوں کا چاک پردہ رہے گا دونوں کو کر کے رسوا
یہ شورشِ ذوقِ دید میری، یہ اہتمامِ حجاب تیرا

زحمت نہ ہو تو در پہ ذرا چل کے دیکھ لو
آیا ہے کوئی اپنا پتہ پوچھتا ہوا

ہر تمنا کے نکلنے پر نہ ہو اتنا مُصر
ورنہ اپنی زندگی سے تو خفا ہو جائے گا

ہم نشیں الفاظ میں تشریح ہو سکتی نہیں
کیا بتاؤں کس طرح راتوں کو گھبراتا ہے دل

اے ساکنانِ دیر و حرم! کہہ رہے ہو کیا؟
باہر کھڑے ہیں حلقۂ دنیا و دیں سے ہم

سحر کی ضو، شفق کی سرخیاں، برسات کے بادل
مجھے ہمراز پا کر یہ مناظر کھائے جاتے ہیں
کوئی حد ہی نہیں اس احترامِ آدمیت کی
بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں
بہت ہی خوش ہوا اے ہم نشیں کل جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

سمجھے گا اس کا درد کون شورشِ کائنات میں
تو نے جسے مٹا دیا پردۂ التفات میں
سانس میں بوئے بادہ ہے سجدے ہیں پائے یار پر
اب بھی دماغِ زہد کو شک ہے مری نجات میں

میرے گدازِ عشق کا تم پہ اثر ہوا ضرور
ناز کا رنگ آ چلا میرے دلِ نیاز میں

واقف ہے جوشؔ، عشق سے اپنے تمام شہر
اور ہم یہ جانتے ہیں کوئی جانتا نہیں

نہ چھیڑ شاعر، ربابِ رنگیں، یہ بزم ابھی نکتہ داں نہیں ہے
تری نواسنجیوں کے شایاں فضائے ہندوستاں نہیں ہے
زباں پہ ہیں صوفیوں کی یارب یہ کیسی بے مغز اصطلاحیں
زمیں کے پردے میں ماسویٰ کا کہیں بھی نام و نشاں نہیں ہے
حریمِ انوارِ سرمدی ہے ہر ایک ذرہ بہ ربِ کعبہ
مرا یہ عینی مشاہدہ ہے، فریبِ وہم و گماں نہیں ہے

جوشؔ کی قدیم غزلوں کے مطالعے سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ انھوں نے رنگِ قدیم میں بھی اپنی افتادِ طبع اور جدتِ ذہنی سے کام لیا ہے، جس میں جرأت، بے باکی اور برجستگی ہے۔ ان کی غزلوں میں محض جدید و قدیم کی بحث نہیں اور نہ فلسفیانہ موشگافیاں ہیں بلکہ ان کے تجربات کی آگاہیاں ہیں۔ جوشؔ نے حالیؔ اور اقبالؔ کی طرح غزلوں میں کوئی پیغام یا اصلاحی

نقطۂ نظر نہیں پیش کیا ہے بلکہ حسرت موہانی کی طرح ارضی اور مقامی رنگ
سے نگار خانۂ غزل کو سجایا ہے یوں تو جوشؔ کا شمار اردو غزل کے
مخالفین میں کیا جاتا ہے مگر وہ غزل اور حسنِ غزل کے سب سے بڑے
پرستار نظر آتے ہیں۔

جوشؔ کی غزلوں میں دروں بینی کا عنصر بھی نمایاں ہے وہ اپنے
آپ میں ڈوب کر غزل کہتے ہیں اور اپنے دل کی دنیا میں بار بار جھانک کر
مفہوم و معنی پیش کرتے ہیں، جوشؔ کے جہانِ دل میں صدہا پری پیکر مثال
رقص ہیں جسے وہ نیم شبی کے وقت ایک ایک کر کے مشاہدہ کرتے ہیں۔
اور پھر ان لمحات طرب افزا کو غزل کے رنگیں پیراہن میں ملبوس
کر دیتے ہیں، جس سے جذبہ اور تخیل آغوش در آغوش نظر آتا ہے
لیکن وہ کوئی انفرادیت نہیں پیدا کر پاتے۔ ہاں جوشؔ، ولولہ، بلند ہمتی
اور عزم جواں ضرور نظر آتا ہے۔ بقول پروفیسر محمد حسن:

"غزلوں میں بھی جوشؔ نے تازگیٔ احساس کو برقرار رکھنے کی کوشش
کی مگر اس کوچے میں وہ اپنا منفرد رنگ پیدا نہ کر سکے۔ انھوں نے حافظ
اور نظیری کی متعدد غزلوں کو اردو میں اپنایا ہے............ان
غزلوں کا حسن ہے تو یہی کہ یہ روایتی روپ رنگ کے بجائے ایک نئی
تابناکی اور حرارت سے معمور ہیں۔" [۱]

جوشؔ کی غزلوں میں مشاہدۂ ظاہر و باطن کا بھرپور پر تو نظر آتا
ہے جس پر فارسیت کا غلبہ قندِ مکرر کا مزا دیتا ہے۔ جیسا کہ خود کہتے ہیں:

آج اے جوشؔ تیرے رنگِ غزل گوئی سے
قندِ پارس کا مزا ہے بزبانِ اردو

---

[۱] شناسا چہرے پروفیسر محمد حسن ص ۴۴

جوشؔ کو اس بات کا احساس ہے کہ انھوں نے فارسی غزل گوئی سے اپنی غزلوں کا خمیر تیار کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں ان کے تاثرات اور احساسات کے تجزیے اور تحلیل کا عمل آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ طویل تجربات اور تلخ حقائق کو مختصر لفظوں میں سمو کر پیش کر دینا ان کی غزل گوئی کا کمال ہے وہ حریم کیف میں ہاؤ ہو بھی کرتے ہیں اور جام و سبو سے صبح کے وقت وضو کرنے کی تلقین بھی دیتے ہیں۔ ان کی بساطِ مے کشی دعوتِ سجدہ ریزی بھی دیتی ہیں۔ لیکن اس کے جلو میں کروڑوں قہریانیاں اور ہزاروں کہانیاں نظر آتی ہیں۔

جوشؔ کی غزل گوئی کی دوسری سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں جہاں شباب [illegible] کے قدم کی آہٹیں سنائی دیتی ہیں وہاں دوسری طرف عہدِ شوق کی کہانیوں کا لطف بھی ملتا ہے گرد میں شباب تازہ کی دل کش حکایات بھی سننے کو مل جاتی ہیں۔ ان کی غزل گوئی کا ایک خاص مزاج اور رجحان ہے۔ جس میں ارتباط باہمی، وسعت نظر، آفاقیت، اثر آفرینی، اظہار کی جرأت، نشاطیہ زندگی اور انقلابی آواز کا تزک و احتشام نظر آتا ہے۔ عشق و عقل کا مکالمہ بھی ان کی غزلوں میں ملتا ہے۔ مگر فلک پر نجم و قمر کا فسون ان پر کچھ اثر نہیں کرتا اس لیے کہ ان کے حریم تمنا میں نرگس جادو، جادو جگاتی رہتی ہے۔ غزل کا یہی وہ جادو ہے جو جوشؔ کی نظموں کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔

غزل ایجاز و اختصار کا فن ہے اس میں نظم جیسی وسعت نہیں لیکن اس کا ایجاز و اختصار ہی اس کی ہمہ گیری کا ضامن ہے۔ یہ اختصار زندگی کی وسعتوں کو سمیٹ کر ایک ثابت اور ابدی حقیقت کی شکل میں پیش کرتا ہے جسے جذبے کی آنچ سے تپایا جاتا ہے اور صداقت نکھر کر سامنے آ جاتی ہے سننے والا یا پڑھنے والا غزل کے شعر پڑھ کر یا سن کر یوں ہی سر نہیں دھنتے

لگتا بلکہ اس کے دل کے تار ابدی صداقت کے اثر سے جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ جذبات کے شعلے لرز اٹھتے ہیں۔ اور اس پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ آہ آہ یا واہ واہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ تمام پاسبانِ عقل ہٹ جاتے ہیں اور جہانِ کیف وسرور آباد ہو جاتا ہے۔ جوشؔ کی غزلوں میں اکثر یہ کیفیت بہت شدت سے پیدا ہوتی ہے جہاں وہ جلالِ خداوندی کو روزِ محشر روک دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور قصیدۂ رحمت کی شفتگی، وارفتگی اور سپردگی کے سامنے عتابِ الٰہی بھی مسکرا پڑے گا۔

جوشؔ کی غزلوں میں درویشی اور مسکینی نہیں بلکہ جذبۂ حصولِ حق ہے وہ غزل کے مزاج کو اس کی ہیئت سے ہم آہنگ رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں کا مجموعی تاثر بھی رہتا ہے اور منفرد کیف بھی۔ اس لیے کہ وہ غزل کے حسن کو شعر میں پیش کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اس پچھلی رات کو جسے کہتے ہیں کم سنی
میری نظر نے صبحِ درخشاں بنا دیا

پنہاں تھیں جس میں روح کی گہری نمونشیاں
اس جنبشِ نظر کو غزل خواں بنا دیا

اے ناز داد دے کہ سرابِ جمال کو
میری نظر نے چشمۂ حیواں بنا دیا

زلفوں کی ہر گرہ کو عطا کی متاعِ دل
ابرو کی ہر شکن کو رگِ جاں بنا دیا

غمزے کے "اشتباہ" کو بخشا "یقینِ ناز"
"وہمِ شرر" کو شعلۂ عریاں بنا دیا

جلووں کو دیں نظامِ دو عالم کی وسعتیں
شوخی کو کائناتِ بداماں بنا دیا

حرم ہو، مدرسہ ہو، دیر ہو، مسجد کہ مے خانہ
یہاں تو صرف جلوے کی تمنا ہے کہیں آجا
بڑے دعوے ہیں اہلِ انجمن کو صبر و تمکیں کے
کبھی جلوت میں بھی اے فتنۂ خلوت نشیں آجا
اذانیں ابر پیما ہیں تو سجدے آسماں فرسا
ذرا مسجد میں بھی اے دشمنِ ایمان و دیں آجا

ملے جو وقت نوائے رہ روِ رہِ اکسیر
حقیرِ خاک سے بھی ساز باز کرتا جا
فراغ رازِ مسرت کے ڈھونڈنے والے
شبوں کو محرمِ سوز و گداز کرتا جا
وہاں جمال کو فرصت نہیں توقف کی
یہیں سے دیدۂ باطن کو باز کرتا جا

لرز رہے تھے شگوفے، تڑپ رہے تھے نجوم
چھڑا ہوا نہیں معلوم کون مسئلہ تھا
زباں پہ آئیں تو ہر حرف سے لہو ٹپکے
ہر ایک سانس میں ان ولولوں کا قافلہ تھا
ادھر تھی لرزشِ صہبا، ادھر خرامِ نگار
خیالی بحث چھڑی تھی، نیا مقابلہ تھا
ہزار شکر ذرا بھی کمی نہ کی اے جوش
اگرچہ دیکھنے میں یار تنگ حوصلہ تھا

اس زمانے میں کہ ہو جامہ دری جیبِ ایماں
راہ میں خار ہے یہ دامن کا بچانا کیسا ؟

جلا دے حسن کے سینے میں آرزو کا چراغ
ضمیرِ سنگ میں سوزِ شرار کی سوگند
بتا نکھرتی ہے کس طرح زلف شانوں پر
نزولِ رحمتِ پروردگار کی سوگند
ٹھہر ٹھہر کے سُنا داستانِ عشوہ و ناز
نزاکتِ دلِ امیدوار کی سوگند

گیتی تو خلفشار ہے گردوں کو اضطراب
محوِ خرامِ ناز ذرا فتنہ بند کر
آیا ہے جوشِ شعلۂ داغِ جگر لیے
مرضی تری پسند نہ کر یا پسند کر

نگاہوں سے برسا دے ابرِ جوانی
مئے لالہ گوں سے گلستانیاں کر
سکوں پاؤں جس سے وہ ہلچل مچا دے
خرد سر جھکا دے وہ نادانیاں کر

اللہ رے اس دشمنِ راحت کا تلوّن
گل بانگِ اماں ہے، تو کبھی شورشِ چنگیز
اے گیسوئے شب رنگ! وہی نکہتِ فردوس
اے نرگسِ مخمور! وہی ساغرِ لبریز

رقصاں رخِ محبوب میں ہے صبح کی نسنگی
بیدار بھی ہو خواب سے اے جوشؔ سحر خیز

ہر ذرۂ حقیر ہے فردوس رنگ و بو
ہر دشتِ بے گیاہ گلستاں ہے آج کل
کیا چیز مل گئی ہے کہ میری نگاہ میں
ہر تاجدار بے سر و ساماں ہے آج کل

اللہ رے گدازِ محبت کے معجزے
کافر تھا جو دماغ مسلماں ہے آج کل

کس زعم میں ہے اے شبِ دیجورِ زندگی
پھر رازدارِ نورِ طلوعِ سحر ہیں ہم
ہے کس خیالِ خام میں اے خار زارِ دہر
پھر کامرانِ خندۂ گل ہائے تر ہیں ہم
آنکھوں میں نورِ مصحفِ جاناں لیے ہوئے
پھر کردگارِ عشق کے پیغام بر ہیں ہم

جوشؔ کے ان اشعار میں نغماتِ سحر خیزی ہیں اور ان کی روح یادِ حبیب میں کروٹوں پہ کروٹیں لے رہی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دل ہی دل میں کسی معشوق سے سرگرم سخن ہیں اور گلشن کا پتا پتا لبِ لعلِ سلمیٰ و عذرا بنا ہوا ہے اور افسردگیِ ماضی و حال کسی دل کش ساز میں دفن ہو گئی ہے۔
جوشؔ کی غزلوں میں صہبا کی تندی و تیزی کے ساتھ لیلائے کیفِ دوش

بھی شامل ہے۔ ان میں کوئی جادو اور افسوں گری نہیں، فقط حسن کی دلبری
نظر آتی ہے۔ جوشؔ کسی لمحہ عشق کی اہانت نہیں برداشت کر سکتے وہ بادۂ عشق
میں بھی سرداری اور سلطانی کا رعب داب رکھتے ہیں۔ جوشؔ کا مزاج تمنا
بھی ایک منفرد انداز کا جذبہ خودداری رکھتا ہے جو عبادت میں بھی داوری
کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ مرض زیست کا علاج مئے کہنہ اور معشوق جواں بتاتے
ہیں اور "حبل المتین" کو دسترس سے باہر دیکھ کر دشت وحشت میں کسی کافر
کا دامن ہی ان کا سہارا بن جاتا ہے۔ دراصل یہی نشاطیہ تصورات شبابی
کیفیات اور انقلابی بیانات جوشؔ کی غزل گوئی کی روح ہیں۔

چار

رُباعی نِگاری

رباعی اردو شاعری کی مختصر، اہم اور مفید صنفِ سخن ہے اس میں دو شعروں میں ایک جہانِ معنی آباد رہتا ہے۔ دنیا کی سبھی اہم زبانوں کے شعر و ادب میں اس صنفِ سخن کا رواج رہا ہے یہ عربی لفظ "رباع" سے مشتق ضرور ہے مگر اس کی ایجاد کا سہرا ایران کے سر ہے۔ فی الحال یہاں رباعی کی ایجاد اور اس کی تاریخ سے بحث کرنا مقصود نہیں ـــــ لیکن اتنا تحریر کرنا ضروری ہے کہ اس صنفِ سخن کے متعلق سب سے پہلے شمس الدین محمد بن قیس رازی نے اپنی تصنیف "المعجم فی معائر اشعار العجم"[10] میں اشارہ کیا ہے اس کے بعد یہ بحث مختلف انداز سے فارسی اور اردو کے مصنفین نے پیش کی ہے۔ شعر العجم حصہ اول از علامہ شبلی نعمانی، "لباب الالباب" از محمد عوفی، تنقید شعر العجم از پروفیسر محمود شیرانی، رسالہ رباعی از مفتی سعد اللہ، معیار البلاغت از سحر بدایونی، بحر الفصاحت از نجم الغنی، قواعد العروض از سید غلام حسنین قدر بلگرامی، سخندانِ فارس از مولانا محمد حسین آزاد، وغیرہ وغیرہ نے رباعی کی ایجاد اور اس کے موجد کے متعلق بڑے دلچسپ انکشافات کیے ہیں جس سے کوئی نتیجہ نکالنا مشکل نظر آتا ہے۔ بہرکیف تمام بحث کے خلاصے کی روشنی میں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس کی ایجاد کوئی حادثہ نہیں ہے۔ بقول پروفیسر محمود شیرانی

"میرا عقیدہ ہے کہ رباعی کسی شخصی ایجاد کا نتیجہ نہیں بلکہ وہ ارتقا یافتہ شکل ہے قدیم چہار بیتی کی جو ہزج مربع اخرم و اخرب میں لکھی جاتی تھی ان ایام میں صدر و ابتدا میں اخرب و مکفوف، اخرب و موفور کا اختلاف

جائز سمجھا جاتا تھا جو چار بیتی کے ہر مصرعہ میں کارفرما ہے۔ جس کی بنا پر پہلے مصرعے کے شروع میں مفعول کے مقابلے میں دوسرے مصرعہ کے شروع میں مفاعیل یا مفاعیلن آجاتا ہے۔ بحر ہزج عربی میں مربع الارکان مستعمل ہے۔ جب عربی عروض فارسی میں اختیار کی گئی تو ضروری ہے کہ ابتدا میں اشعار ہزج کے مربع میں لکھے جاتے ہوں۔ چنانچہ رباعی بھی مربع میں لکھی گئی۔ چونکہ اس میں چار مصرعہ ہوا کرتے ہیں اس بنا پر اس کا نام چار بیتی رکھا گیا۔ ایک عرصۂ دراز کے بعد جب اصول مثمنات کی دریافت نے اہلِ ایران کو زیادہ خوش آئینہ اور شگفتہ اوزان سے آشنا کر دیا۔ مربعات ترک کر دیے گئے، اور مثمنات کو اختیار کر لیا گیا اور ترانہ جو چار بیت مربع پر مشتمل تھا۔ دو بیت مثمن کے قالب میں ڈھل گیا اور دو بیتی کہلایا۔ یہی اصول یعنی مربع کا مثمن کر دینا نہ صرف رباعی میں بلکہ دیگر اوزان میں بھی کام کر رہا ہے۔" [۱]

اس بیانات سے یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ رباعی کی ایجاد کسی ایک شخص کی نہیں۔ رہا سوال اس روایت کا جسے تقریباً سبھی عروض دانوں نے اپنی کتب میں تحریر کیا ہے کہ امیر یعقوب کے بچے کے منہ سے ایک مصرعہ جوز بازی کرتے وقت نکلا — ع

"غلطاں غلطاں ہمی رود تا لبِ گو"

اور اس کو با موزوں پا کر مزید تین مصرعے لگا کر رباعی بنائے گئے محلِ نظر اور تحقیق طلب ہے گو کہ مولانا محمد حسین آزاد "سخندانِ فارس" اور مولوی شبلی نعمانی شعر العجم میں اس روایت کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔

---

[۱] تنقید شعر العجم حصہ دوم پروفیسر محمود شیرانی

اردو کے دیگر اصنافِ سخن کی طرح اردو رباعی بھی فارسی کی رہینِ منت ہے۔ مضمون کے اعتبار سے بھی یہ اخلاق، فلسفہ، حکمت، تصوف، اور حسن وعشق کے سنجیدہ پہلوؤں کی ترجمان رہی لیکن رفتہ رفتہ اردو رباعی کے اپنی وسعتوں میں اضافہ کیا۔ جوش ملیح آبادی نے اردو رباعی کو مضامین کے اعتبار سے مزید وسیع اور متنوع بنایا ہے۔ جوش کی رباعیات کے موضوعات میں خمریہ، عشقیہ، فلسفہ، علم وعقل، خودی، غم، قضا وقدر، جبر و اختیار، فنا و پیری، سیاسی، سماجی، اخلاقی وغیرہ اہم ہیں۔ لیکن خیام کی طرح جوش کی رباعیوں میں خمریہ رنگ کا عنصر نمایاں ہے اور عمر خیام و جوش، دونوں کی شخصیت میں بہت حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر سلام سندیلوی:۔

"جوش اور عمر خیام میں اندرونی مماثلت بڑی حد تک موجود ہے سب سے بڑی مماثلت جو ان دونوں شعراء میں ہے وہ ان کا رندانہ مزاج ہے۔ دونوں نے پیرِ مغاں کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ دونوں کی محبوب ترین شے بادۂ انگوری ہے، اور دونوں نے اعلانیہ ساغر و جام فضا میں اچھالے ہیں۔ دراصل جوش کے پاس رباعی، عمر خیام کی وساطت سے پہنچی ہے جوش نے اپنی نوجوانی کے ایام میں عمر خیام کا مطالعہ کیا، جو ان کے رندانہ مزاج کے موافق تھا۔ اس کے علاوہ عمر خیام کے یہاں رسم ورواج سے بیزاری اور سماج سے بغاوت کے آثار بھی ملتے ہیں۔ جوش کے ضمیر میں بھی یہ عناصر موجود تھے۔ لہٰذا جوش نے اپنے میں عمر خیام کو سدا رہتا پایا۔"[1]

"سیف وسبو" میں جوش نے اپنی رباعیات کو پیش کیا ہے ایک عنوان "خمریات بنام خیام" بھی قائم کیا گیا ہے۔ جس کے تحت ان رباعیوں کو جمع

---

[1] اردو رباعیات ڈاکٹر سلام سندیلوی ص ۵۳۸

کر دیا گیا ہے جو عمر خیام کے فلسفۂ نشاط و عیش سے متعلق ہیں، چند رباعیات ملاحظہ ہوں:

ہشیار کہ آفتاب ہونا ہے تجھے
پیغمبر انقلاب ہونا ہے تجھے
ہر صبح کو آتی ہے یہ ساقی کی صدا
بیدار کہ خود شراب ہونا ہے تجھے

کیا شیخ ملے گا گل فشانی کر کے
کیا پائے گا توہین جوانی کر کے
تو آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے انہیں
جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے

ہشیار کہ دل سے تاب دتب جاتی ہے
آغوش سے لیلائے طرب جاتی ہے
ساقی غم صبح و فکرِ فردا تا کے
دینا ہے تو دے جام کہ شب جاتی ہے

گھومی تاریک رات میرے دل میں
بدمست ہوئی حیات میرے دل میں
ساقی نے صبوحے کے اٹھایا جو رباب
گم ہو گئی کائنات میرے دل میں

مفلوج ہے ہر اصطلاحِ ایماں کر دے
فردوس کو رہنِ طاقِ نسیاں کر دے
ساقی ہے، خنکی ہے، چمن ہے، مے ہے
اس نقد پہ سو ادھار قرباں کر دے

ممنوع شجر سے لطفِ پیہم لینے
عصیاں کی گھنی چھاؤں میں پھر دم لینے
آوازہ دو، کاشمیر آ پہنچا جوش
اللہ سے انتقامِ آدم لینے

انفاس سے بجھ رہی ہے شمعِ آداب
چیخوں سے فضا میں پڑ رہے ہیں گرداب
صہبا کو نہ کر دے کہیں اللہ حرام
کس نے یہ کمینے کو پلا دی ہے شراب

یہ رات گئے عینِ طرب کے ہنگام
پرتو یہ پڑا الپشت سے کس کا سرِ بام
"یہ کون ہے؟" "جبریل ہوں" "کیوں آئے ہو؟"
"سرکار! فلک کے نام کوئی پیغام؟"

اے خواب بنا ہی ہے باغِ رضواں
حوروں کا کہیں پتا نہ غلماں کا نشاں
اک کنج میں خاموش و ملول و تنہا
بے چارے ٹہل رہے ہیں اللہ میاں

اب مطربِ وقت کا ترانہ ہے کچھ اور
بدلی ہوئی دنیا کا فسانہ ہے کچھ اور
ہاں نازکیِ طبع کی روکے ہوئے باگ
شبیر حسن خاں یہ زمانہ ہے کچھ اور

مے کش کا سرورِ بے کلاہی بہتر
یا شیخ کا کبرِ حق پناہی بہتر
طاعت بہ ریا و بادہ نوشی بہ خلوص
دونوں میں ہے کون شے الٰہی بہتر

حق کو نہ ان اربابِ یقیں سے پوچھو
صوفی سے نہ شیخِ درس و دیں سے پوچھو
برداشت کی طاقت ہو تو اسرارِ حیات
رندانِ خرابات نشیں سے پوچھو

باغوں پہ وہ چھا گئی جوانی ساقی
سنکی وہ ہوائے زندگانی ساقی
ہاں جلد انڈیل جلد، بہتی ہوئی آگ
آیا وہ برستا ہوا پانی ساقی

دل کی جانب رجوع ہوتا ہوں میں
سرتا بہ قدم خضوع ہوتا ہوں میں
جب مہرِ مبیں غروب ہو جاتا ہے
پیمانہ بکف طلوع ہوتا ہوں میں

وہ رات گئے شراب ڈھلنا ہے ہے
وہ پچھلے پہر صبا کا چلنا ہے ہے
معشوقۂ نوخیز کا وہ رہ رہ کر
آنکھوں کا ہتھیلی سے وہ ملنا ہے ہے

غم کو توڑیں گے یہ کھلونے دیکھو
چہرے جیسے بچھڑے بچھو سے نے دیکھو
جس کوہ سے گر چکے ہیں لنکا والے
اس کوہ پہ چڑھ رہے ہیں بونے دیکھو

اپنی ہی غرض سے جی رہے ہیں جو لوگ
اپنی ہی عبائیں سی رہے ہیں جو لوگ
ان کو بھی ہے کیا شراب پینے سے گریز
انسان کا خون پی رہے ہیں جو لوگ

مفقود ہے رسم و راہ الفت ساقی
اگلی سی کہاں وہ آدمیت ساقی
دے بادہ کہ اس عصر ہوس پرور میں
ہم لوگ بھی ہیں بہت غنیمت ساقی

رومانی

جوش کا رومانی پن ان کی رباعیوں میں بھی جھلکتا ہے۔ ان کا جمالیاتی احساس بہت قوی ہے۔ وہ زندگی اور ادب میں انقلاب کے قائل ہیں

وہ کسی کی کورانہ تقلید کے قائل نہیں۔ جوش کی ان رباعیات میں کوئی سوقیانہ پن نہیں بلکہ فارسی اور عربی الفاظ کی شمولیت سے بڑی صفائی اور بلندی آگئی ہے:۔

دل رسم کے سانچے میں نہ ڈھالا ہم نے
اسلوبِ سخن نیا نکالا ہم نے
ذرات کو چھوڑ کر حریفوں کے لیے
خورشید پہ بڑھ کے ہاتھ ڈالا ہم نے

نوخاستہ شاعرو ٹھٹھر جاؤ گے
تقلید یوں ہی رہی تو مر جاؤ گے
جب تک مجھے گم نہیں کرو گے بچو
کہتا ہوں کہ اپنے کو نہیں پاؤ گے

دنیائے سخن کے گیسوؤں کو سلجھاؤ
جو میں نہیں کر سکا وہ کر کے دکھاؤ
اللہ کرے میرے کم سن شعراء
تم مجھ سے ہزار چند آگے بڑھ جاؤ

یہ سلسلۂ لاتناہی ہے کہ زلف
گہوارۂ بادِ صبح گاہی ہے کہ زلف
اے مستِ شباب دوشِ سیمیں پہ ترے
ڈھلتی ہوئی رات کی سیاہی ہے کہ زلف

چونکا ہے کوئی نگار، الہٰی توبہ
رس میں ڈوبا خمار، الہٰی توبہ
سکتے میں ہیں بھیرویں کی تانیں گویا
ہونٹوں کا خفیف ابھار، الہٰی توبہ

کاکل کھل کر بکھر رہی ہے گویا
نرمی سے ندی گزر رہی ہے گویا
آنکھیں تری جھک رہی ہیں مجھ سے مل کر
زینے سے دھوپ اتر رہی ہے گویا

یہ بال سیہ، یہ گال گورے گورے
مکھڑے پہ یہ موجِ بادہ کے ہلکورے
غنچوں پہ مچل رہی ہیں کرنیں گویا
آنکھوں میں ہیں غلطیدہ گلابی ڈورے

الماس کی کان ہیں تمہاری آنکھیں
شعلوں کی زبان ہیں تمہاری آنکھیں
ارجن کے کمان ہیں تمہارے ابرو
برچھوں کی دکان ہیں تمہاری آنکھیں

جانے والے قمر کو روکے کوئی
شب کے پیکِ سفر کو روکے کوئی
تھک کے مرے زانو پہ وہ سویا ہے ابھی
روکے روکے سحر کو روکے کوئی

ناگن بن کر مجھے ڈسنا بادل
باراں کی کسوٹی پہ نہ کسنا بادل
وہ پہلے پہل جدا ہوئے ہیں مجھ سے
اس دیس میں اب کی نہ برسنا بادل

مکھڑوں سے بٹی راج دلاری گلیاں
چوتھی کی دلہن کی طرح پیاری گلیاں
دل کی نگری سے آہ بھرتی گزریں
کل رات کو لکھنؤ کی ساری گلیاں

تم خاتم ہستی پہ نگیں تھیں اک روز
آشوبِ دل و فتنۂ دیں تھیں اک روز
آواز سے اب تک یہ پتہ چلتا ہے
تم کتنی خطرناک حسیں تھیں اک روز

تیری زلفوں میں ہے کہانی میری
تیری پلکوں میں ہے گہر فشانی میری
یہ جو تیری آنکھوں میں ہیں غلطاں ڈورے
گزری تھی یہیں سے کل جوانی میری

کیا طرفہ لٹک ہے یار جانی تیری
لب سرخ تو چوڑیاں ہیں دھانی تیری
ہر دل کا تموج ہے تبسم تیرا
رادھا کا لڑکپن ہے جوانی تیری

اک گونج سی تن بدن میں لہراتی ہے
اک تان سی زندگی میں بل کھاتی ہے
پازیب اتارے انھیں جگ بیت چکا
جھنکار رہے لیکن نہیں جاتی ہے

جس دیس میں آباد ہوں بھوکے انساں
احساسِ لطیف کا وہاں کیا، امکاں
اک فکرِ معاش پر نچھاور سو عشق
اک نانِ جویں پر لاکھ مکھڑے قرباں

گفتار میں کھل رہی ہے بیلے کی کلی
رفتار میں مڑ رہی ہے ساون کی ندی
چہرے پہ سرورِ نور آنکھوں میں غرور
سرکار نے کیا آئینہ دیکھا کہ ابھی

زلفیں ہیں کہ ژولیدہ خیالات کی رات
اے جانِ حیا! ٹھہر بھی جا رات کی رات
ان تیرہ گھٹاؤں میں کدھر جائے گی
شانوں پہ لیے ہوئے برسات کی رات

مرضی ہو تو سولی پہ چڑھانا یا رب
سو بار جہنم میں جلانا یا رب
معشوق ہیں "آپ ہمارے ہیں بزرگ"
ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یا رب

سونے کی بات ہے یہ بات آؤ سو جائیں
بدمست ہے خود حیات آؤ سو جائیں
شبنم سے ہے چاندنی کا دامن نمناک
اب بھیگ چکی ہے رات، آؤ سو جائیں

یوسف کے کلیجے کو مسلتی تھی کبھی
ہاں مصر میں یہ نسیم چلتی تھی کبھی
وہ لہر گزر رہی ہے ترے رخ سے
جو روئے زلیخا پہ مچلتی تھی کبھی

نغمے ترے فریاد ہوئے جاتے ہیں
خوں گشتہ بیداد ہوئے جاتے ہیں
راتیں یہ جوانی کی، مرادوں کے یہ دن
افسوس! کہ برباد ہوئے جاتے ہیں

اے ابر! سحر کو گھر کے آنے والے
خورشید کو ظلمت میں چھپانے والے
اب تک مرے پہلو میں ہے وہ پیکر ناز
قرباں ترے! عمر شب بڑھانے والے

کیا آج تعارف میں لجایا کوئی
کیا جانیے کیوں سنبھل نہ پایا کوئی
میں نے جو کہا "جوش مجھے کہتے ہیں"
آنکھوں کو جھکا کے مسکرایا کوئی

اللہ رے بدمست جوانی کا نکھار
ہر نقشِ قدم پہ سجدہ کرتی ہے بہار
اس طرح وہ گامزن ہے فرشِ گل پر
پڑتی ہے ہری دھوپ پہ جس طرح پھوار

"فلسفۂ خودی"

افسوس کہ محدود ہے عرفاں تیرا
قطرے کی گرفت میں ہے طوفاں تیرا
تو خود کو سمجھ رہا ہے جزوِ عالم
عالم تو خود اک جزو ہے ناداں تیرا

ہستی و عدم کی انجمن ہے تجھ میں
کیا ذکر چمن، روحِ چمن ہے تجھ میں
قرنوں سے رواں ہے جو رگِ عالم میں
وہ خونِ حیات موجزن ہے تجھ میں

آوارہ کو آسودۂ منزل کر دو
ناداں کو داناؤں میں شامل کر دو
در پہ آیا ہے وحی لے کر جبریل
خدام، خود اس پہ وحی نازل کر دو

"جبر و اختیار"

خود سے نہ اداس ہوں نہ مسرور ہوں میں
بالذات نہ روشن ہوں نہ بے نور ہوں میں
مختار ہے، مختار ہے، مختار ہے تو
مجبور ہوں، مجبور ہوں، مجبور ہوں میں

تجھ سے جو پھرے گی تو کدھر جائے گی
لے جائے گا جس سمت ادھر جائے گی
دنیا کے حوادث سے نہ گھبرا کہ یہ عمر
جس طرح گزارے گا گزر جائے گی

"علم"

اکثر انعام قہر بن جاتا ہے
یہ بحر کثیف ہنر بن جاتا ہے
وہ علم کہ اکسیر ہے انساں کے لیے
گر ہضم نہ ہو تو زہر بن جاتا ہے

اک عمر میں ہوتی ہے بصیرت پیدا
کرتا ہے خدا شاذ یہ دولت پیدا
رگ رگ میں تفکر نہ اتر جائے اگر
خود علم سے ہوتی ہے جہالت پیدا

"فنا و پیری"

کچھ بھی نہیں دنیا میں سوائے دنیا
کہنا نہ پڑے قبر میں ہائے دنیا
دنیا کے مزے اٹھالے اے خانہ خراب
قبل اس کے کہ تری لاش اٹھائے دنیا

عقبیٰ کی خبر نہ عمرِ دنیا معلوم
تا چند رہیں گے بحر و بر کیا معلوم
ہم خاک ہیں اور خاک ہو جائیں گے کل
اب تک تو ہوا ہے صرف اتنا معلوم

کہنے یہ ہے اب حیات جاگو یارو
سن لو ایک آدھ بات جاگو یارو
تیار ہے کاروانِ عمر فانی
اب بھیگ چکی ہے رات جاگو یارو

پیری کی ہوا کوچ کا لائی پیغام
سینے سے اکھڑ رہے ہیں پھولوں کے خیام
غلطاں ہیں مہ و سال کی کرنیں سر پر
اے شمعِ حیات و شبنمِ عمر سلام

"سیاسی اور سماجی"

قانون نہیں ہے کوئی فطرت کے سوا
دنیا نہیں کچھ نمودِ طاقت کے سوا
قوت حاصل کر اور مولا بن جا
معبود نہیں ہے کوئی قوت کے سوا

تبلیغ ہے تو جینے کی محبت میں مرد
غارِ ہستی کو نیست ہو ہو کے بھرد
نوعِ انساں کا درد اگر ہے دل میں
اپنے سے بلند تر کی تخلیق کرو

ہر سانس کو دو نفسِ حد شرارت کر دیں
اخلاق کی کچھ عجیب حالت کر دیں
مفلس کہ امیروں کے گناتے ہیں گناہ
دولت انھیں دے دو تو قیامت کر دیں

تم میں اک فرد بھی مرا فی نہ رہے
اک امر بھی امر اتفاقی نہ رہے
ہاں جنگ کا اعلان کرو صرف اسوقت
جب صلح کا امکان ہی باقی نہ رہے

کیوں مفت میں زندگی کو ہلکان کرو
دنیا کو فضول کیوں پریشان کرو
خود کو جب تک نہ حق پہ قائم کر لو
بھولے سے کبھی جنگ کا نہ اعلان کرو

تقدیر کی یہ دروغ بافی افسوس
بزناؤ یہ رحمت کے منافی افسوس
فاقے کے شکار ہیں کروروں بندے
اللہ کی یہ وعدہ خلافی افسوس

آیا وہ انقلاب آیا جاگو
فرمانِ شکستِ خواب آیا جاگو
اے ہند کے بدنصیب سونے والو
سر پہ وہ آفتاب آیا جاگو

ہاں خون کے گھونٹ پی رہا ہوں اے دوست
دل کے زخموں کو سی رہا ہوں اے دوست
گویا سرِ کوہ ایک تنہا پودا
یوں اپنے وطن میں جی رہا ہوں اے دوست

محرومِ نشاطِ زندگی ہوں اب تک
پامالِ خری دابلہی ہوں اب تک
اس دور کا تو گواہ رہنا اے جوش
میں اپنے وطن میں اجنبی ہوں اب تک

"اخلاقی"

ہندو ہوں نہ اے جوش مسلمان ہوں میں
صد شکر، نہ ظلمت ہوں، نہ طوفان ہوں میں
آب و گلِ ہند سے ہوں اور ہندی ہوں
نسلِ آدم سے ہوں اور انسان ہوں میں

مخلص نہ سہی ظلم کا بانی تو نہ بن
شمشیرِ عناد کی روانی تو نہ بن
کرتا نہیں احسان کا اقرار نہ کر
محسن کا مگر دشمنِ جانی تو نہ بن

ذہنی مُردوں سے دل لگاؤں کیوں کر
چلتی لاشوں کے پاس جاؤں کیوں کر
مجرم ہو تو لاکھ بار کر لوں برداشت
احمق کا مگر بار اٹھاؤں کیوں کر

تجھ سے ہے ترے عیب کے باعث جو خفا
ممکن ہے کہ ہو جائے کبھی دوست ترا
لیکن جو ترے ہنر سے رکھتا ہے عناد
وہ شخص کبھی دوست نہیں ہو سکتا

اک فتنہ ہے ناقصوں میں کامل ہونا
اک قہر ہے وابستۂ منزل ہونا
تاریخ کے اوراق جو الٹے تو کھلا
اک جرم ہے احمقوں میں عاقل ہونا

وہ دل جس کا عناد گھر جاتا ہے
بے چارہ خود اپنی لو پہ جل جاتا ہے
ہر فرد کو ہوتی ہے عدو سے نفرت
اور ہم کو تو دشمن پہ ترس آتا ہے

ہر سانس میں گردوں سے پیام آتے ہیں
ہر آن چھلکتے ہوئے جام آتے ہیں
بندوں کو جو اک بار نگاتا ہوں گلے
اللہ کے سو بار سلام آتے ہیں

جب کبھی ربط کی گھٹا چھاتی ہے
یاروں کی برائی کب نظر آتی ہے
احباب کے باقی نہیں رہتے ہیں صفات
احباب کی صرف ذات ہی رہ جاتی ہے

"پیرانِ سالوس"

قبروں پہ مریدوں کو جھکاتے رہیے
ڈھولک پہ سفیہوں کو نچاتے رہیے
اللہ اگر روٹھ رہا ہے روٹھے
کیا اس سے غرض عرس مناتے رہیے

ہر رنگ میں ابلیس سزا دیتا ہے
انساں کو بہ ہر طور سزا دیتا ہے
کر سکتے نہیں گنہ جو احمق ان کو
بے روح نمازوں میں لگا دیتا ہے

جنت کے مزوں پر جان دینے والو
گندے پانی میں ناؤ کھینے والو
ہر خیر پہ چاہتے ہو ستر حوریں
اے اپنے خدا سے سود لینے والو

اکثر انعام قہر بن جاتا ہے
یہ بحر، کثیف نہر بن جاتا ہے
وہ علم کہ اکسیر ہے انساں کے لیے
گر ہضم نہ ہو تو زہر بن جاتا ہے

ہم دیکھ کے مولویوں کو کیا کہتے ہیں
اتنا ہی کہ بس "صل علیٰ" کہتے ہیں
لیکن یہ غلام زر یہ ریش دراز
موقع ہو تو ہر بت کو "خدا" کہتے ہیں

دراصل نظم کے بعد جوش نے سب سے زیادہ اپنی توجہ کا مرکز رباعی کو ہی قرار دیا ہے۔ ان کی رباعیوں میں تمام تر مضامین کی اعلیٰ مثالیں مل جاتی ہیں۔ ان کی طنزیہ، عشقیہ، رومانی، اخلاقی، سیاسی اور سماجی وغیرہ

رباعیوں میں ایک فن کار کی سچی روح جلوہ گر ہے۔ رباعی بڑی ہی سخت اور جان لیوا صنف سخن ہے۔ اس کی عروضی و ہیئتی ترکیب کے ساتھ مضامین کی رفعت پختگی ذہن کا مطالبہ کرتی ہے۔ جوش کی رباعیوں میں ہندوستانی تہذیب و تمدن کے لازوال مرقع ملتے ہیں۔ ان کی رباعیوں نے سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگیوں کو آئینہ دکھلایا ہے۔ جوش کی رباعیوں نے اردو شعراء کو نئی راہ دکھلائی ہے۔ اس صدی میں جوش سے بڑا اردو شاعری میں کوئی رباعی نگار شاعر نہیں ہو سکا ہے۔ انھوں نے اپنی فطری ذہانت سے اس صنف سخن کو دلچسپ اور دل کش عناوین سے روشناس کرایا۔ ان کی رباعیاں اردو شاعری کا لازوال سرمایہ ہیں۔

جوش کو زبان و بیان پر بڑی قدرت ہے وہ جب غیر مانوس اور ناتراشیدہ الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں تو ان کا صرف کچھ اس انداز سے ہوتا ہے کہ ان کے حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جوش نے نظام اخلاق کو بھی اپنی رباعیوں میں پیش کیا ہے اور رومانی انداز دل ربائی سے لطف اندوز ہونے کا موقع بھی دیا ہے۔ وہ ریاکار زاہد و واعظ پر بھرپور طنز کرتے ہیں اور بے روح عبادت کو عذاب قرار دیتے ہیں۔ جوش انسانوں کی بنیادی اقدار حیات پر زور دیتے ہیں اور "انسانیت" کی تکمیل کے لیے خلوص دل سے کوشاں نظر آتے ہیں۔ چونکہ ان کا مذہب اور دین انسانیت اور انسان دوستی ہے اسی لیے ان کی رباعیوں میں اس وقت کے حالات کا بھرپور پرتو بھی نظر آتا ہے اور اس عہد کے سیاسی نظام پر ضرب کاری بھی۔ وہ ہر حال اور ہر مقام پر عظمتِ انسان اور حرمتِ آدمیت کو بلند سے بلند تر دیکھنا چاہتے ہیں۔

جوش نے عقل و دانائی اور علم و جہالت کے موضوعات بھی بڑی خوش اسلوبی سے اپنی رباعیوں میں نظم کیے ہیں جس سے فطری طور پر ایک طنز کی سی

کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ ان کی عشقیہ رباعیوں میں بھی برد بار رکھ رکھاؤ ہے کہیں عریانیت نہیں پیدا ہو پاتی ہے جب کہ فراق ایسے مقامات پر کھل گئے ہیں۔ میں جوش اور فراق کی رباعیوں کا موازنہ نہیں کر رہا ہوں لیکن ایک بات عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ دونوں کی رباعیوں کے اثرات، ماحول، زبان اور پیش کش میں بڑا واضح فرق ہے "روپ" کی رباعیاں اکثر فحاشی اور عریانیت کی حدیں پار کر جاتی ہیں جب کہ جوش سنجیدگی و متانت کے دامن کو نہیں چھوڑتے ہیں۔ غرقِ مئے گلفام ہونے پر مزید دائرۂ اخلاق میں آ جاتے ہیں، یہ ایک با شعور فن کار کی دلیل ہے کہ وہ علمی و ادبی تقاضوں سے کسی حال میں منحرف نہ ہو۔

پانچ

مرثیہ نگاری

اب یہ حقیقت محتاجِ بیان و تعارف نہیں رہ گئی ہے کہ اردو مرثیہ نے اردو شاعری کو وسعت جامعیت اور اہمیت بخشی ہے۔ یہ صنف الگ بھگ پانچ سو سال کی تاریخ رکھتی ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے اشرف کو پہلا مرثیہ گو قرار دیا ہے[۵۱] لیکن ڈاکٹر رشید موسوی[۵۲] اور ڈاکٹر مسیح الزماں[۵۳] نے اس بیان سے اتفاق نہیں کیا ہے اور زیرِ دید کے ذیل میں مختصر مرثیہ کی ہیئت سے بحث کی ہے۔ میرا یہ نقطۂ نظر ہے کہ ابتدا میں اردو مرثیہ کی کوئی ہیئت مقرر نہیں تھی بلکہ مختلف ادوار میں یہ تغیرات سے دوچار ہوتا رہا ہے۔ کبھی یہ شہادت نامہ کی مخصوص ہیئت کی شکل میں ملتا تھا اور کبھی قصیدے کی شکل میں۔ خود "شہادت نامہ" ہیئت کے اعتبار سے مثنوی سے زیادہ مماثلت رکھتا ہے۔ شمالی ہند میں دستیاب شہادت ناموں کا مطالعہ و تجزیہ اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ یہ کبھی از قسم مثنوی ہوتے تھے۔ اس اعتبار سے اشرف کی "مثنوی" "نوسر ہار" جس کا سنہ تصنیف ۹۰۹ ہجری ہے، اردو کا پہلا مرثیہ قرار پائے گی۔ اور اس طرح اردو مرثیہ کی تاریخ کی وسعت اور حد پانچ صدی پر محیط ہو جائے گی۔ اس پانچ سو سال میں اردو مرثیہ مثلث، مربع، مخمس، اور اب مسدس کے روپ میں ڈھل کر سامنے آیا ہے۔

---

۵۱ دکن میں اردو — نصیر الدین ہاشمی

۵۲ دکن میں عزاداری اور مرثیہ — ڈاکٹر رشید موسوی

۵۳ اردو مرثیہ کا ارتقا — ڈاکٹر مسیح الزماں ص ۴۹، ۵۰

جنوبی ہند سے شمالی ہند اور پھر اودھ کی سرزمین پر اس صنفِ سخن نے بے پناہ ترقی کی منزلیں طے کیں اور اردو کی دیگر اصنافِ سخن و ادب پر اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے۔ غزل ہو یا مثنوی، قصیدہ ہو یا رباعی، قطعہ ہو یا اور کوئی صنف، تقریباً سبھی ممتاز اور سنجیدہ اصناف میں مرثیے کی روح اور واقعۂ کربلا کی واقعیت کسی نہ کسی شکل میں ضرور مل جاتی ہے۔ اور بیسویں صدی میں بھی اردو مرثیہ اسی آب و تاب کے ساتھ سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی تمدنی، تاریخی، بصیرت اور شعور کا حامل بنا ہوا ہے۔ ہندوستان کی دیگر علاقائی زبانوں اور بولیوں میں بھی مرثیے کا رواج ہے۔ جن کے نام اور ہئیت میں فرق ہے۔ یہ مرثیے، داہا، دہے، اور دوہے وغیرہ کے نام سے جانے جاتے ہیں ان کی مختلف ہئیت ہوتی ہے۔

جوشؔ نے اپنے مرثیوں کو مسدس کی شکل میں پیش کیا ہے لیکن اجزاء اور عناصر میں فرق ہے۔ یہ فرق مرثیہ نگارانِ سلف کے کارناموں سے انحراف اور تقلید کی شکل میں نہیں، بلکہ ایک نئی شاہراہ ایجاد کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔ انھوں نے چہرا، سراپا، رخصت، آمد، رجز، واقعاتِ جنگ، شہادت بین اور دعا کے التزامات کسی پابندی سے نہیں برتے ہیں۔ جوشؔ کے ہم عصر مرثیہ نگاروں میں جمیل مظہری، سید آل رضا، آثر لکھنوی، نسیم امروہوی، ماتی جائسی، وغیرہ کافی اہمیت کے مالک ہیں۔ لیکن جوشؔ نے دنیائے مرثیہ نگاری میں بھی ایک انقلاب برپا کر دیا اور ایک نئی طرز ایجاد کی۔

جوشؔ کے مراثی میں سب سے زیادہ سماجی اور سیاسی شعور کی کارفرمائی نظر آتی ہے وہ عہدِ حاضر کے ذہنی رویے، عصرِ حاضر کی تہذیب نو کے گرفتاروں اور موجودہ نسل کے اندازِ فکر و نظر، نت نئے بدلتے ہوئے معاشرتی اور سیاسی میلانات اور مطالبات اور ان سے پیدا شدہ مسائل پر بڑی عمیق نظر رکھتے ہیں۔ ان کے مراثی کی ابتدا۔ انھیں سب موضوعات سے ہوتی ہے، وہ حق و صداقت

کے نقیب ہیں۔ ان کے مرثیوں کے موضوعات بھی آوازۂ حق، حسین اور انقلاب، موحد و مفکر، وحدتِ انسانی، طلوعِ فکر، عظمتِ انسان، موت و حیات، اور جد و جہدِ حیات وغیرہ ہیں۔ جوش اجتہادِ فکر و نظر میں یقین کامل رکھتے ہیں اس لیے ان کے مرثیوں میں نیا جذبہ و عمل، جدید اسلوب بیان، سائنٹفک مثالیں اور عالم گیر انسانیت کے موثر عنوانات ملتے ہیں، وہ ان پہلوؤں کو نظم کرتے ہیں، جن سے مرثیے کی جاذبیت وسعت، مقبولیت اور ہمہ گیریت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ چند مراثی کے تمہیدی حصے ملاحظہ ہوں:-

مرثیہ "آوازۂ حق" ۱۹۱۸ء

کیوں کر نہ کروں شکر خدائے دو جہاں کا
بخشا ہے مرے دل کو مزا سوزِ نہاں کا
یکساں ہے مسرت کا عمل سود و زیاں کا
ہو نارِ جہنم بھی تو لطف آئے جناں کا
ہوتی ہے خوشی صحت و آزار سے مجھ کو
خلعت یہ ملا ہے تری سرکار سے مجھ کو

سینے میں چھپائے ہوں جو انوار کسی کے
دل میں نہیں آتے ہیں خیالات دوئی کے
رونے کے ہوں اسباب، کہ سامان ہنسی کے
جو چیز ہے ڈھل جاتی ہے سانچے میں خوشی کے
لیلائے شبِ تار ہے یا حورِ سحر ہے
جس حال میں ہوں "حسن" مرے پیشِ نظر ہے

اغیار کی فوجیں ہوں کہ احباب کی محفل
گرمی کے بگولے ہوں کہ لیلیٰ کی ہو محمل

راہوں کی صعوبت ہو کہ خوابِ سرِ محفل
ہوتا ہے ہر ایک چیز سے لبشاشش مرا دل

صد شکر مرے دل پہ حقیقت یہ عیاں ہے
ہر آئینے میں دوست کی تصویر نہاں ہے

ہو رنگ کا انبار کہ برسات کا دریا
وہ جیٹھ کی ہو دھوپ کہ بادل کا ہو پردا
وہ لُو کے تھپیڑے ہوں کہ ہو لوچ صبا کا
وہ خالِ سیہ ہو کہ چمکتا ہوا تارا

اے حسن کے صانع، ترے اسرار نہاں ہیں
ہر شے میں کم و بیش کچھ انوار نہاں ہیں

دب جاتے ہیں غم سے جو خیالات ہیں اسفل
ہو جاتے ہیں انسان کے اخلاق مکمل
غم نفس کا قاتل ہے تو باطن کی ہے صیقل
مر جاتا ہے جب سانپ نکل جاتے ہیں سب بل

جی کھول کے رونا ہے علاج آنکھ کے نل کا
ہر آہ سے کچھ زہر نکل جاتا ہے دل کا

تکلیف کو تفریح بنا لینے کی صنعت
حاصل ہے انہیں جو ہیں پرستارِ حقیقت
آئینہ ہے اسرار کا ہر منظرِ قدرت
وہ چاند کی خنکی ہو کہ سورج کی حرارت

مہمل ہیں یہ لفظیں، یہ برا ہے وہ بھلا ہے
جو کچھ ہے وہ صرف ایک تبسم کی ضیا ہے

ہو دوست کے پہلو میں نشیمن تو مسرت

مل جائے اگر راہ میں دشمن تو مسرت
ہو زیرِ قدم سبزۂ گلشن تو مسرت
کانٹوں میں الجھ جائے جو دامن تو مسرت

تدبیر اگر وصل کی ہو رقص کی جا ہے
اور ہجر کی شب ہو تو تڑپنے کا مزا ہے

جس کا یہ عقیدہ ہے کہ "میں عابد و معبود"
اس بزم کا قانون یہ کہتا ہے وہ "مردود"
سب ایک حقیقت میں ہیں ساجد ہو کہ مسجود
ہے کفر یہ کہنا "یہ ایاز اور وہ محمود"

ہاں لفظِ انا الحق میں "انا" باعثِ شر ہے
اس سے یہ ٹپکتا ہے خودی پیشِ نظر ہے

ہر دل کو یہاں کام ہے تسلیم و رضا سے
ہر لب کو یہاں عہد ہے تسبیحِ خدا سے
کیا اس سے سروکار ہے بھوکے ہوں کہ پیاسے
پرہیز بڑا یہ ہے کہ نفرت ہو دوا سے

دعوت میں یہاں بھوک ہے خلعت میں کفن ہے
انعام یہاں سب سے بڑا دار و رسن ہے

اک روز ہوا شوق مرے دل میں یہ پیدا
اس راہ سے گزرے ہیں جو نام آور و یکتا
حالات بھی کچھ ان کے میں دیکھوں کہ وہ تھے کیا
اس شوق میں تاریخ کے اوراق کو الٹا

فہرست میں آکر نام تھا جو سب سے جلی تھا
مژدہ ہو کہ وہ نام حسین ابن علی تھا

مرثیہ "آوازۂ حق" میں جوشؔ نے تمہید کے لیے اس موضوع کو منتخب کیا ہے جس سے ہر انسان دوچار ہوتا ہے۔ انسان کشمکشِ سود وزیاں، وہم و گمان، ظلمت اور روشنی میں الجھا رہتا ہے۔ جوشؔ نے اسی اہم مسئلے کو مختلف انداز سے پیش کیا ہے اور پھر بغیر کسی اجزائے ترکیبی کی طوالت کے براہِ راست گریز کرتے ہیں اور اپنے ممدوح کو تلاش کر لیتے ہیں جو ان مسائل سے نبرد آزما رہتا ہے اور جو سبھی راہِ دشوار و خارزار سے مسکراتا ہوا گزر جاتا ہے اس کا نام کشتگانِ حق و صداقت کی فہرست میں سب سے جلی حروف میں "حسین ابن علیؑ" لکھا ہوا ہے اور جس نے شمشیر کے سایہ میں بھی نعرۂ حق بلند کیا اور اور خشک ہونٹوں سے بھی صداقت کا پیغام دیتا رہا۔ اس مرثیہ میں قدیم مرثیہ نگاری کے سبھی اجزا ملتے ہیں۔ لیکن بعد کے مراثی میں ان کی جدت طرازی نمایاں ہے۔

جوشؔ کا دوسرا اہم مرثیہ "حسین اور انقلاب" ہے اس کا سنہ تصنیف ۱۹۴۱ء ہے۔ یہ جوشؔ کا سب سے زیادہ انقلابی مرثیہ ہے۔ اور اس نے اپنے عہد میں تہلکہ مچادیا تھا۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی کا بھرپور تاثر اس مرثیہ میں جھلکتا ہے اور اسی بنا پر انگریز نواز حضرات نے جوشؔ کے خلاف منظم سازش شروع کر دی تھی۔ اس نے برطانوی سامراج کے بہی خواہوں کے حوصلے پست اور ذہن مفلوج کر دیے تھے۔ اس کا اصل راز جوشؔ کی زبانی ملاحظہ ہو۔

"میں نے آغا صاحب کے امام باڑے میں ایک مسدس پڑھا "حسین اور انقلاب" کے نام سے "حسین اور انقلاب" سننے کے لیے پورا ادبی لکھنؤ ٹوٹ پڑا تھا۔ امام باڑے میں تل دھرنے کی جگہ باقی نہ تھی لکھنؤ کے تمام شعرا، تمام اساتذہ، یہاں تک کہ مولانا صفیؔ بھی تشریف لائے اور اس مجلس میں فقط شیعہ ہی نہیں اہلِ سنت اور ہندو بھی شریک ہوئے تھے۔

چونکہ اس مسدس میں آہ و فغاں پر زور دینے کے بدلے ایثار و کردار حسینؑ پر عمل کرنے کی بالکل پہلی بار ترغیب دی گئی تھی، اس لیے ارباب مجلس نے بالعموم اور اعیان ریاست نے بالخصوص بار بار کھڑے ہو کر اس جوش و خروش سے داد دی تھی کہ ان کی آوازوں کے تھپیڑوں سے منبر تک جنبش پیدا ہو گئی، اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سامعین اپنے اپنے گریبان پھاڑ کر میدان جنگ میں کود پڑیں گے۔

حکومت کے کان تک یہ غلغلہ پہنچا تو اس نے شیعہ صاحبوں (خان بہادروں اور سروں) کو طلب کر کے یہ ہدایت کی وہ کوئی ایسی تدبیر نکالیں کہ اس مسدس کا اثر زائل ہو جائے۔ اپنے آقا کا حکم سن کر انھوں نے مشورہ کیا اور مشورے کے بعد وہ تمام حسینؑ کے پرستار، یزید کی حمایت پر تیار ہو کر لکھنؤ کے سب سے بڑے مجتہد سید ناصر حسین صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان سے کہا کہ ارباب مجلس نے بالعموم اور بانی مجلس حکیم صاحب عالم نے بالخصوص، ہمارے دین کی زبردست توہین کی ہے اور منبر حسینؑ[ا] پر جوش صاحب کے سے علانیہ بادہ خوار کو بٹھا کر تذلیل کا بھی ارتکاب کیا ہے، اس لیے آپ اس مجلس کے باطل ہونے کا فتویٰ صادر فرما دیں۔

قبلہ و کعبہ نے مجھے بلا بھیجا، مجھے دیکھتے ہی ان تمام سرکار پرستوں کے چہروں پر حیرانی کی ایک لہر دوڑ گئی اور چائے نوشی کے بعد قبلہ و کعبہ نے اپنے بائیں طرف مصلے بچھوا کر، جب مجھ سے یہ ارشاد فرمایا کہ جوش صاحب زحمت نہ ہو تو آپ میرے مصلے پر بیٹھ کر اپنا وہ مسدس سنا دیں جو آپ نے آغائی صاحب کے امام باڑے میں پڑھا تھا ۔۔ تو ۔۔ حکومت کے ایجنٹوں کی صفوں میں ایک کھلبلی اور بوکھلاہٹ پیدا ہو گئی، اور جب میں

ا منبر حسین کی بجائے منبر رسولؐ ہونا چاہیے (ش ۔ ا)

کیا خار و خس کہ وہ تو ہیں معتوبِ روزگار
نسرین و نسترن میں بھی پنہاں ہے نوکِ خار

نغمے ہیں جنبشِ دلِ مضطر لیے ہوئے
گل برگ تک ہے تیزیِ خنجر لیے ہوئے

یارانِ سرفروش و نگارانِ مہ جبیں
آبِ نشاط و لعلِ لب و زلفِ عنبریں
کوئے مغان و بوئے گل و روئے دل نشیں
زور و زرِ ذکاوت و ذہن و زر و زمیں

جو شے بھی ہے وہ درد کا پہلو لیے ہوئے
ہر گوہرِ نشاط ہے آنسو لیے ہوئے

اس خوں چکاں حیات کے آلام کیا کہوں
قدرت نہیں فسانۂ ایام کیا کہوں
دارائے کائنات سے انعام کیا کہوں
یہ داستانِ مرحمتِ عام کیا کہوں

کہہ دوں تو دل سے خون چھلک جائے
اور چپ رہوں تو منہ سے کلیجا نکل پڑے

جوش "اعلانِ حق" کو سب سے مشکل امر کہتے ہوئے زیادہ واضح انداز میں کہتے ہیں اور صداقت کا ایک شعر اس بند کی بیت قرار دیتے ہیں:

یوں تو غمِ معاش کا سوزِ نہاں ہے اور
تکلیفِ جاں گدازیِ عشقِ بتاں ہے اور
لب تشنگیِ شیب و عذابِ خزاں ہے اور
اعلانِ امرِ حق کی مگر داستاں ہے اور

"گفتارِ صدق مایۂ آزار می شود
چوں حرفِ حق بلند شود دار می شود"

ہاں اس بلا سے کوئی بلا بھی بڑی نہیں
کیا اس کو علم جس پہ یہ بپتا پڑی نہیں
شیروں کی اس کے لاش بھی اکثر گڑی نہیں
اعلانِ امرِ حق سے کوئی شے کڑی نہیں

بے جرم خود کو جرم میں جو باندھنے وہ آئے
اس راہ میں جو سر سے کفن باندھ لے وہ آئے

ہوتا ہے جو سماج میں جویائے انقلاب
ملتا ہے اس کو ملحد و زندیق کا خطاب
پہلے تو اس کو آنکھ دکھاتے ہیں شیخ و شاب
اس پہ بھی وہ نہ چپ ہو تو پھر قوم کا عتاب

بڑھتا ہے ظلم و جور کے تیور لیے ہوئے
تشنیع و طعن و دشنہ و خنجر لیے ہوئے

اور بالخصوص جب ہو حکومت کا سامنا
رعب و شکوہ و جاہ و جلالت کا سامنا
شاہانِ کج کلاہ کی ہیبت کا سامنا
قرنا و طبل و ناوک و رایت کا سامنا

لاکھوں میں ہے وہ ایک کروڑوں میں فرد ہے
اس وقت جو ثبات دکھائے وہ مرد ہے

اور بالخصوص بند ہو جب ہر درِ نجات
حق تشنہ لب ہو دشت میں باطل لبِ فرات
دستِ باطل میں ہوں زن و فرزند تک کی ذات

حائل ہو مرگ و زیست میں جینے دے کے ایک رات

یہ وہ گھڑی ہے کانپ اٹھے شیر نر کا دل
اس تھیلکے کو چاہیے فوق البشر کا دل

تاریخ دے رہی ہے یہ آواز دم بدم
دشتِ ثبات و عزم ہے دشتِ بلا و غم
صبرِ مسیح و جرأتِ سقراط کی قسم
اس راہ میں ہے صرف اک انسان کا قدم

جس کی رگوں میں آتشِ بدر و حنین ہے
جس سورما کا اسم گرامی حسینؑ ہے

جوش کے مراثی میں اس بات کا خاص اہتمام ملتا ہے کہ وہ تمہیدی بند سے مرثیے کا موضوع مربوط رکھتے ہیں۔ تفصیلی ژرف ـــــ بینی کے ساتھ ان کے مراثی میں فلسفے کا بھی لمس ملتا ہے جس سے وہ ارتقائے تہذیبِ حیات کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے اصل مقصد کی طرف اسی ترتیب و اہتمام سے آگے بڑھتے ہیں۔ ان کا سب سے اہم مرثیہ "موجد و مفکر" ہے اس میں ۱۱۶ بند ہیں اور سنہ ۱۹۵۵ء کی تصنیف ہے۔ تمہید کے چند بند ملاحظہ ہوں:

مسکرا کر جب ہوئی طالع تمدن کی سحر
جنگلوں سے شہر کی جانب مڑی فکرِ بشر
رہنمائی آرزوئے بام، چونکا ذوقِ در
کشتِ خاکی تار میں اگنے لگے شمس و قمر
خوشۂ حسنِ زمیں یوں ناز سے پکنے لگے
داب کر دانتوں میں انگلی آسماں تکنے لگے

جب اشاروں کو صدا بن کر نکھرنا آگیا
اور صدا کو لفظ میں ڈھل کر ابھرنا آگیا
لفظ کو پھر حرف بن کر گل کترنا آگیا
تاکہ صداقت کو بالآخر بات کرنا آگیا

لب ہلے تو کشتیاں چلنے لگیں اعجاز کی
فکر انساں کو سواری مل گئی آواز کی

سر جھکایا جہل نے پھر علم کے دربار میں
دائرے بننے لگے جنبش ہوئی پرکار میں
آئینے کا ذوق جاگا خاطرِ زنگار میں
سبزۂ ارشاد لہکا گلشنِ گفتار میں

اور پھر سبزے کے تختوں میں روانی آگئی
نبضِ انساں کی نسیں بھیگیں، جوانی آگئی

خشک تر کو جانچتی ارض و سماں کو ناپتی
صبح کا مکھڑا دکھاتی شام کو منہ ڈھانپتی
دوڑتی، بڑھتی، لپکتی، دندناتی، ہانپتی
گنگناتی، گھومتی، گھِرتی، گرجتی، کانپتی

بربطِ تکرارِ تخلیقات پر گاتی ہوئی
موت کو نیچا دکھاتی ناز فرماتی ہوئی

آدمی میں رفتہ رفتہ آدمیت آگئی
وضع میں تمکین، جذبوں میں نزاکت آگئی
بات میں تاثیر آنکھوں میں مروت آگئی
روح فرسا اجنبیت میں اخوت آگئی

شور ہائے غم گساری کو بھڑکنا آگیا

دل کو اور دل کی مصیبت میں دھڑکنا آ گیا

ناز سے جزوِ مکاں بن کر زماں گانے لگا
طائروں کا ذکر کیا خود آشیاں گانے لگا
زمزمے بکھیرے زمیں نے آسماں گانے لگا
چمنیوں میں کارخانوں کا دھواں گانے لگا
حوصلے نوعِ بشر کے ناز فرمانے لگے
ہاتھ باندھے آب و آتش کے خواص آنے لگے

ان میں کوئی خود نوازی کے لیے کوشاں نہیں
صرف اک خدمت کی دھن ہے دوسرا ارماں نہیں
مانگ کھائیں کچھ عبادت سے یہ وہ انساں نہیں
یہ "خدا" یا "آدمی" سے اجر کے خواہاں نہیں
حسن کے خلاق آب و رنگ کے بانی ہیں یہ
شہریارِ کشورِ اجلالِ انسانی ہیں یہ

دل کو لیکن سخت استعجاب ہے اے ہم نشیں
اتنے احسانات کے باوصف یہ روشن جبیں
بن نہ پائے زیرِ سقفِ آسماں صدرِ زمیں
اور تو اور آدمی کے حافظے تک میں نہیں
نام ان کا دہر کے آفاق بینوں میں نہیں
یہ سفینوں میں تو ہیں موجود سینوں میں نہیں

یہ بظاہر ہے بڑی احسان فراموشی کی بات
حافظوں سے محو ہو جائیں دبیرانِ حیات
کون سمجھائے مگر خم ہائے زلفِ نفسیات
صرف اسے انساں سمجھتا ہے امیرِ کائنات

موڑ کر ذہنِ بشر کو گلستانوں کی طرف
جو اڑاتا ہے زمیں کو آسمانوں کی طرف

لطف سے جو موڑتا ہے بادہ ہائے نفسیات
جو بدل دیتا ہے آب و رنگِ تصویرِ صفات
جس سے بن جاتا ہے تعمیری تصورِ حیات
جس سے تنہائی میں روحِ زندگی کرتی ہے بات

محفلِ آفاق میں تابندہ رہتا ہے وہی
نفسِ عالم گیر بن کر زندہ رہتا ہے وہی

بخشتا ہے معتدل فکر و عمل کا جو وقار
آندھیوں کو جو بناتا ہے نسیمِ لالہ زار
جس کے ابرِ نطق سے باقی ہے صوتِ برگ و بار
معنوی آبائے انسانی میں ہوتا ہے شمار

بارشیں قرنوں کی اس کا قصر ڈھا سکتی نہیں
آندھیاں اس کے چراغوں کو بجھا سکتی نہیں

تھا انہیں آبائے انسانی میں اک مردِ جلیل
قبلۂ عالم، امامِ عصر، امیرِ بے عدیل
اعتبارِ موجِ کوثر، آبروئے سلسبیل
فخرِ اسمٰعیلؑ، جانِ مصطفیٰؐ، نازِ خلیلؑ

محورِ گیتی و گردوں، مرکزِ دنیا و دیں
مہبطِ آوازِ حق، مخدومِ جبریلِ امیں

جوشؔ کے مراثی میں تاریخ اسلام کا بھرپور ادراک اور شعور ملتا ہے
وہ رجز خوانی کا وہ انداز تو نہیں پیش کرتے جو اردو مراثی میں نظم کیا

جا نا رہا ہے۔ بلکہ اس میں بھی جدت سے کام لیتے ہیں اور مدح کردار، ذات اور صفات، تمہید کے ارتباط اور مرثیے کے عنوان سے ہم آہنگ بنا دیتے ہیں وہ اسے صرف بیانیہ اور سپاٹ پن کی نذر نہیں کر دیتے بلکہ لطفِ زبان شکوہِ خیال، اسالیبِ بیان کو صنائع و بدائع سے دل کش اور دل نشیں بنا دیتے ہیں۔ وہ ایک مسحور کن فضا قائم کر دیتے ہیں مگر یہ سحر، حقیقت سے دور نہیں رکھتا۔ چند مراثی کے کچھ حصے ملاحظہ ہوں:

"حسین اور انقلاب"

جو صاحبِ مزاجِ نبوت تھا وہ حسینؑ
جو وارثِ ضمیرِ رسالت تھا وہ حسینؑ
جو خلوتیٔ شاہدِ قدرت تھا وہ حسینؑ
جس کا وجود فخرِ مشیت تھا وہ حسینؑ

سانچے میں ڈھالنے کے لیے کائنات کو
جو تولتا تھا نوکِ مژہ پر حیات کو

جو اک نشانِ تشنہ دہانی تھا وہ حسینؑ
گیتی پہ عرش کی جو نشانی تھا وہ حسینؑ
جو خلد کا امیرِ جوانی تھا وہ حسینؑ
جو اک سنِ جدید کا بانی تھا وہ حسینؑ

جس کا لہو تلاطمِ پنہاں لیے ہوئے
ہر بوند میں تھا نوح کا طوفاں لیے ہوئے

جو کاروانِ عزم کا رہبر تھا وہ حسینؑ
خود اپنے خون کا جو شناور تھا وہ حسینؑ
اک دینِ تازہ کا جو پیمبر تھا وہ حسینؑ
جو کربلا کا داورِ محشر تھا وہ حسینؑ

جس کی نظر پہ شیوۂ حق کا مدار تھا
جو روحِ انقلاب کا پروردگار تھا

جوشؔ نے مدحِ کردار اور تعارفِ حسینؑ میں جذباتی انداز نہیں اپنایا ہے بلکہ تاریخی حقائق حدیث و قرآن کی روشنی میں پیش کئے ہیں۔ یہ مصرع " جو خلد کا امیرِ جوانی تھا وہ حسینؑ " دراصل رسولِ کائنات کی اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ " حسنؑ اور حسینؑ جوانانِ جنت کے سردار ہیں "۔

مرثیہ "آوازۂ حق" کی رجز ملاحظہ ہو حضرت امام حسینؑ فوجِ اعدا اور شمرِ ستم گار کو متوجہ کر کے فرماتے ہیں:

اس باپ کا بیٹا ہوں جو تھا اشجعِ عالم
جس فرق پہ تھا سایہ فگن فتح کا پرچم
جس ذات سے اسلام کی بنیاد تھی محکم
تھا اصل میں جو قوتِ پیغمبرِ اکرم
طفلی میں بھی ساونت کو اژدر کو نہ چھوڑا
بے توڑے ہوئے قلعۂ خیبر کو نہ چھوڑا

جس روز مدینے سے سدھارے تھے پیمبرؐ
اس روز برادر کی جگہ پر تھا برادر
ہر چند کہ تیغوں کی چمک تھی سرِ بستر
سوتا تھا بڑے لطف سے تانے ہوئے چادر
دنیا میں کوئی ایسا جری ہو نہیں سکتا
جس طرح وہ سوئے تھے کوئی سو نہیں سکتا

اس رجز میں مستند تاریخی واقعات ہیں، جو سبھی اسلامی تاریخ وکتبِ سیر میں مل جاتے ہیں۔ عہدِ طفلی میں حضرت علی ابن ابی طالب کا کلّہ اژدر کا دو پارہ کرنا، درِ خیبر کا اکھاڑنا، شبِ ہجرت بسترِ رسولؐ پر اپنی ہوئی تلواروں کے سایہ میں استراحت کرنا، یہ وہ معتبر تاریخی حقائق ہیں جو براہِ راست اسدِ کردگار حضرت علیؓ کا کارنامہ ہیں۔

قدیم انداز کا رجز یہ پہلو، جوشؔ کے مرثیوں میں نہیں ہے۔ وہ اکثر و بیشتر تمہید کے بندوں سے براہِ راست تعارف کی طرف گریز کرتے ہیں اور پھر مدح اور واقعات کی طرف رجوع ہوتے ہیں جس میں عام انسانی اخلاقی قدروں کی روشنی میں کردار کے تابناک پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں۔ زبان کی تاثیر الفاظ کی نشست اور نادر تراکیب، تشبیہات و استعارات کے جلو میں معراجِ کلام کا مظہر ہیں۔ چند مراثی کے بند ملاحظہ ہوں:۔

"موحد و مفکر"

عالمِ اسرارِ عالم، عارفِ ذات و صفات
ناظمِ شہرِ ثقافت، ناشرِ اخلاقیات
ناصرِ حق، پیکرِ آئین، دستورِ نجات
نازشِ تاریخ، میرِ وقت دارائے حیات

حرفِ دیں، نطقِ مبیں، درسِ عمل، فخرِ ملل
بربطِ دستِ مشیّت، نغمۂ سازِ ازل

منکسر، خوددار، شبنم طبع، صفدر، بردبار
صبر پیماں، شام گستر، روز در شب زندہ دار
تاج کوب، اورنگ سوز، ایواں شکن سلطاں شکار
اولیاء اجلالِ پیغمبر سِتَم، یزداں وقار

جامعِ ابریق و سنداں صاحبِ سیف و قلم

چترِ حق، بالائے سر، تاجِ شہاں، زیبِ قدم

شمعِ عرفاں، آفتابِ رشد، قندیلِ اصول
مشعلِ بابِ نبوت، کعبۂ حسنِ قبول
بوستانِ مرتضیٰ، فردوسِ آغوشِ بتولؑ
زینتِ اورنگِ قدرت، راکبِ دوشِ رسولؐ

اسمِ اعظم در بغل، اکلیل ہائے عرفاں در کلاہ
خلد بر کف، آسماں بر دوش، کرسی بر نگاہ

ہاں اسی کے دور میں گیتی پہ چھایا تھا جنوں
آدمی پہ چل گیا تھا حبِ دولت کا فسوں
بچ رہے تھے منبروں پر سیم و زر کے ارغنوں
تھم کے آخر ہو گئی تھی دین پر دنیائے دوں

ظلمتوں کے کھٹ لگے تھے روشنی کے سامنے
موت منہ کھولے کھڑی تھی زندگی کے سامنے

اس کے بعد جوشؔ ان تاریخی عوامل کی طرف دبی زبان سے روئے سخن کرتے ہیں جو دراصل واقعۂ کربلا کا پیش خیمہ تھے:

اہلِ دل سے کہہ رہی ہے یہ مورخ کی زباں
بعدِ پیغمبر ہوئی تھیں کس طرح سرگوشیاں
چھا گیا تھا ہر طرف کس طرح دولت کا دھواں
کیا دبے پاؤں چلے تھے سازشوں کے کارواں

اب بھی ان امواج میں ڈوبی پڑی ہے کربلا
ہاں انھیں کی ایک تاریخی کڑی ہے کربلا

کربلا میں امرِ حق کی برتری سے جنگ تھی
طاقتِ نانِ شعیرِ حیدریؑ سے جنگ تھی

عظمتِ دیرینۂ پیغمبری سے جنگ تھی
جس کا قرآں میں ہے ذکر اس دلاوری سے جنگ تھی

کب نفاق اربابِ حق سے برسرِ پیکار تھا
وہ خدا پر آخری لات و ہبل کا وار تھا

کفر نے کاٹا نہیں تھا مصحفِ ناطق کا سر
اصل میں قرآن وہ پھینکا گیا تھا خاک پر
حملہ آور ابنِ حیدرؑ پہ نہ تھے اربابِ شر
ضرب تھی وہ اصل میں اسلام کی بنیاد پر

چند جاں بازوں کی جانب رخ نہ تھا آفات کا
دن پہ وہ دراصل دھاوا تھا اندھیری رات کا

موحد و مفکر

"وحدتِ انسان" کے چند بند اسی ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:-

تو وہ ہے جو رسن سے نہ سہما نہ دار سے
ٹکر ترے ثبات نے لی کوہسار سے
فتنوں کے سر جھکائے خمِ ذوالفقار سے
تو نے غرور چھین لیا شہریار سے

بیعت کی خواستگار حکومت نہیں رہی
شاہی میں تیرے بعد یہ جرأت نہیں رہی

تو نے ثبات و صبر کے دریا بہا دیے
سارے نقوشِ ہیبتِ سلطاں مٹا دیے
فتنوں کے سر جھکائے پرخچے اڑا دیے
تو نے زمیں پہ فقر کے سکے بٹھا دیے

تیرے لبوں نے طرحِ عناں گیر ڈال دی

تو نے ہوس کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی

جھٹکوں نے رکھ دیا تھا زمیں کو جھنجھوڑ کر
خنداں تھا جہل علم کی آنکھوں کو پھوڑ کر
نازاں تھا سنگ شیشۂ رنگیں کو توڑ کر
"لا" مڑ رہا تھا دامنِ "اِلّا" کو چھوڑ کر

تو نے فضورِ ذوقِ بغاوت کو ڈھا دیا
"اِلّا" کے در پہ "لا" کو دوبارہ جھکا دیا

تو نے دلوں کو دولتِ بیدار بخش دی
خوفِ اجل کو ہمتِ پیکار بخش دی
نطقِ گدا کو طاقتِ گفتار بخش دی
پیشِ خدیوِ جرأتِ انکار بخش دی

مظلوم کے غرور کو بیدار کر دیا
ناطاقتیٔ نبض کو تلوار کر دیا

تیری نئی ادا میں ہیں عبد اللہ خو
جب تو سنانِ سنگ بنا گنگ رنگ و بو
اور جب کبھی بگڑ کے ہوا گرمِ گفتگو
آہن کے جوہروں سے ٹپکنے لگا لہو

مولا! تری سرشت نے سانچے میں ڈھال کے
ڈانڈے ملا دیے ہیں جمال و جلال کے

ہاں اے حسین مصلحِ افکار مرحبا
اے بے نیازِ اندک و بسیار مرحبا
اے تیغِ انقلاب کی جھنکار مرحبا
اے دستِ کردگار کی تلوار مرحبا

تونے لہو سے شمع جلادی عقول کی
ہوتا نہ تو تو نبض نہ چلتی اصول کی

جس کی ہر سانس میں ہو ولولۂ خیرِ انام
نیند جس کی ہو عزیزوں کی محبت میں حرام
جادۂ خدمتِ انساں پہ جو ہو گرمِ خرام
اس الوہی بشریت پہ درود اور سلام

حاملِ اوجِ الوہیتِ انساں تھے حسینؑ
ہاں اسی جادۂ خدمت پہ خراماں تھے حسینؑ

قافلے دھوپ میں جس وقت کہ چکراتے تھے
ہائے کیا دل تھا انھیں چھاؤں میں لے آتے تھے
دادِ احسان کی ملتی تھی تو شرماتے تھے
تشنہ لب دیکھ کے دشمن کو تڑپ جاتے تھے

دشتِ بے آب میں کوثر کی روانی تھے حسینؑ
کشتِ انساں پہ برستا ہوا پانی تھے حسینؑ

چشمۂ بذل و سخا، دجلۂ جود و احساں
مصلحِ وضعِ جہاں، عزتِ نوعِ انساں
لنگرِ کشتیٔ حق، ناشرِ حکمِ یزداں
خادمِ خستہ دلاں، ہادمِ قصرِ سلطاں

خاورِ صدق و صفا، داورِ ایثار حسینؑ
کل جہاں قافلہ و قافلہ سالار حسینؑ

بزمِ اجمال میں تفسیرِ مفصل تھے حسینؑ
طاعتِ متصل و حمدِ مسلسل تھے حسینؑ
شاہدِ گل بدن، حجلۂ مقتل تھے حسینؑ

ہادیٔ پختۂ دانشانِ کمل تھے حسینؑ
سایۂ تیغ میں بھی درسِ وفا دیتے تھے
انتہا یہ ہے کہ قاتل کو دعا دیتے تھے

مراثی جوش میں گھوڑے کی تعریف، تلوار کی مدح بھی مختصراً بیان ہوئی ہے۔ اس میں انیس کا پرتو نظر آتا ہے:

ابن قطبہ فوجِ شام کا بہت بہادر سردار ہے وہ میدانِ جنگ میں بڑے کرّوفر سے آتا ہے اور حضرت امام حسینؑ پر حملہ آور ہو جاتا ہے اس کے بعد حضرت امام حسینؑ تلوار کے جوہر دکھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں ابن قطبہ سردارِ فوجِ شام تیر اور نیزے کے حملے میں جب ناکام رہتا ہے اور شرما جاتا ہے تو تلوار کا وار کرتا ہے اس کا حوصلۂ جنگ نکل جانے کے بعد حضرت امام حسینؑ اپنے وار دکھاتے ہیں:-

شرمایا تو نامرد بڑھا تول کے تلوار
تا دیر شہِ دیںؑ پہ تواتر سے کیے وار
بچپنے کی طرح ہانپ رہا تھا وہ بد اطوار
حضرت نے کہا "اب مری باری ہے خبردار"
اتنی تو خبر تھی کہ چلی فرقِ لعیں پر
دیکھا کہ اتر آئی تھی مرکب سے زمیں پر

خوں پونچھ کے حضرت نے کیا نعرۂ تکبیر
تلوار سے ہنس کر یہ کہا واہ ری شمشیر
چلتی ہے تو کرتی نہیں دم بھر کی بھی تاخیر
کس حسن سے تو کھینچتی ہے موت کی تصویر

تو موت کا سیلاب ہے تو برقِ فنا ہے
پیغام اجل کا ترے دامن کی ہوا ہے

کیا جوہرِ شمشیر تھا، کیا زورِ شجاعت
نزدیک کوئی آئے، نہ پڑتی تھی یہ ہمت
تابندہ خط و خال میں تھی برقِ امامت
حیدرؑ کی جو سطوت تھی تو حمزہؓ کی جلالت

شمشیر نہ تھی، فوج پہ بجلی کی چمک تھی
یا ابرِ سیہ تاب میں کوندے کی لپک تھی

جس سر پہ چلی پیکرِ بے جاں نظر آیا
جس سمت گئی، خون کا طوفاں نظر آیا
اونچی جو ہوئی، برق کا داماں نظر آیا
نیچی جو ہوئی، قہر کا ساماں نظر آیا

تلوار تھی، یا ساز، کہ نغمہ تھا غم اس کا
تھا مرکزِ آوازِ فنا زیر و بم اس کا

رجز خوانی کا اثر اور تیغ زنی کی کیفیت دونوں کو جوش نے ایک جگہ سمو کر پیش کیا ہے جس میں تاثیرِ کلامِ امامؑ مضمر ہے:

لیکن ہوا ذرا بھی نہ حجت کا جب اثر
مائل ہوئے جہاد پر سلطانِ بحر و بر
اٹھتی ہوئی نگاہ سے اڑنے لگے شرر
جھومے علیؑ کی شان سے تلوار چوم کر

گویا گھٹا کی اوٹ سے بجلی نکل پڑی
ٹھہری زباں، نیام سے تلوار ابل پڑی

شورِ رجز بلند ہوا زار ہو گیا
لہجے سے گرم خوف کا بازار ہو گیا
روزِ عروجِ شام، شبِ تار ہو گیا
نکلا جو منہ سے حرف وہ تلوار ہو گیا
گویا فضا پہ ایک کٹاری اُبھر گئی
کانوں سے کافروں کی کمر تک گزر گئی

سکن جو تھے غرور کے وہ سر جھکا دیے
ایوانِ خسروی کے پرخچے اڑا دیے
لب تشنگی نے خون کے دریا بہا دیے
پیاسے نے آبِ تیغ کے جوہر دکھا دیے
برپا دیارِ کوفہ میں کہرام ہو گیا
دیوِ فساد لرزہ بر اندام ہو گیا

شیرازۂ کتابِ حکومت بکھر گیا
سلطان کے غرور کا دریا اتر گیا
کردارِ تشنہ کام بڑا کام کر گیا
پانی سپاہِ شام کے سر سے گزر گیا
حق کی نگاہِ ضرب سے بے تاب ہو گئے
باطل کے پیروؤں کے جگر آب ہو گئے

پل بھر میں سانس اہلِ جفا کی اکھڑ گئی
بیعت کے طمطراق کی صورت بگڑ گئی
دستِ خدا سے کسوتِ شاہی ادھڑ گئی
دربار پر بہ حکمِ قضا اوس پڑ گئی

حق نے رنگِ سقیفہ کی چھل بل نکال دی
پائے بنی اُمیہ میں زنجیر ڈال دی

مراثی جوشؔ میں حقیقت نگاری کا عنصر بحیثیتِ فن نظر آتا ہے جس میں انسانی فطرت کی مطابقت کے ساتھ اشیاء کی فطرت اور اس کا لازمی نتیجہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ لیکن تاریخی حقائق اور اصل پیدا شدہ نتائج میں کوئی فرق نہیں آنے پاتا۔ دراصل جوشؔ کے مرثیے حقیقت نگاری کا اچھا اور دل کش نمونہ ہیں۔ جوشؔ سے قبل مراثی میں کسی نہ کسی شہید کا حال لازمی طور پر بیان کیا جاتا تھا اور تاریخی ترتیب سے شہدائے کربلا کا ذکر ہوتا تھا۔ جوشؔ نے اسے موضوعاتی بنا دیا اور اس سے کردار اور بین کا ربط باقی رکھا ہے جو نفسِ واقعہ سے متعلق ہے منظر نگاری کے بھی کامیاب نمونے ہیں کچھ حصے ملاحظہ ہوں:

"طلوعِ فکر"

جب چہرۂ افق سے اٹھی سرمئی نقاب
کانپے نجوم، زرد ہوا روئے ماہتاب
کھنکے فلک کے جام، کھلے سرخیوں کے باب
اڑنے لگا عبیر، برسنے لگی شراب
رنگوں کی آب و تاب جگانے لگی فضا
آہستگی سے ہوش میں آنے لگی فضا

چونکی زمیں، تبسمِ پنہاں لیے ہوئے
افسانۂ شباب کا عنواں لیے ہوئے
روئے خنک پہ رنگِ شبستاں لیے ہوئے
آنکھوں کے جھٹ پٹے میں چراغاں لیے ہوئے

تاروں کی چھاؤں جذب کیے بھیرویں اٹھی
گویا بڑی لچک سے کوئی نازنیں اٹھی

نوخاستہ فضاؤں میں اک طرفہ پیش و پس
بجتا ہوا اندی میں ملائم نوائے جرس
کھلتی ہوئی زمیں کی کمانی بہر نفس
شبنم کے آب و رنگ میں پچھلے پہر کا رس

گل چہرہ پتیوں پہ نگینے جڑے ہوئے
گوشِ چمن میں اوس کے بندے پڑے ہوئے

نازل ہوئے دلوں پہ نوریں تصورات
پائی خیام ذہن نے زربفت کی قنات
گوٹے پہ ہاتھ رکھ کے تھرکنے لگی حیات
چومک لیے ہوئے حرکت کی چلی برات
خورشید کے ورود سے گلزار جاگ اٹھا
یوسف جو آئے مصر کا بازار جاگ اٹھا

یوں ہی فرازِ روح پہ ابھرا اک آفتاب
دیں کا نشاں، خرد کا علَم، آگہی کا باب
حق ساز و حق نواز و حق آواز و حق مآب
مقصودِ عرش، سورتِ افلاک، بو تراب
عرفانِ زندگی کا علَم کھولتا ہوا
بندِ قبائے لوح و قلم کھولتا ہوا

پیدا ہوا سرورِ ازل سلسبیل میں
اتری شعاع سینۂ فکرِ جمیل میں
روشن ہوئے چراغ دیارِ خلیل میں

جنبش ہوئی دوبارہ پرِ جبرئیل میں
چھپنے لگی شعاع، تفکر کے باب سے
پھوٹی کرن جبینِ رسالت مآب سے

گھومی کلیدِ فضل، کھلا قفلِ فیضِ عام
ناگاہ آسمان پہ گونجا زمیں کا نام
گردش میں آئے نعرۂ صلِّ علیٰ کے جام
پڑھتے ہوئے درود بڑھے انبیا تمام
کعبہ کے گرد ایک کرن گھومنے لگی
روحِ محمدِ عربی جھومنے لگی

"وحدتِ انسانی"

اے دوست دل میں گردِ کدورت نہ چاہیئے
اچھے تو کیا بروں سے بھی نفرت نہ چاہیئے
کہتا ہے کون پھول سے رغبت نہ چاہیئے
کانٹے سے بھی مگر تجھے وحشت نہ چاہیئے
کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو سبزہ زار کا
پالا ہوا ہے وہ بھی نسیمِ بہار کا

جو موج دشت میں ہے وہی لالہ زار میں
جو "رو" سراب میں ہے، وہی جوئے بار میں
جو شے ہے برگِ گل میں، وہی نوکِ خار میں
تفریق ناروا ہے خزاں اور بہار میں
وضع و روش میں فرق سہی جان ایک ہے

تیور جدا جدا ہیں، مگر آن ایک ہے

ہاں نار میں لپک ہے وہی جو ہے نور میں
ذرات میں دمک ہے وہی جو ہے طور میں
غیبت میں بھی جھنک ہے وہی جو ظہور میں
پتھر میں بھی کھنک ہے وہی جو بلور میں

یہ فرق اسم و شکل، فریب نگاہ ہے
اے دوستو! دوئی کا تصور گناہ ہے

انساں اگر ہے شیوۂ شرکِ دوئی کو چھوڑ
انساں کشی کی آڑ میں اس خودکشی کو چھوڑ
توہینِ ارتباطِ خفی و جلی کو چھوڑ
ناداں اہانتِ گہرِ زندگی کو چھوڑ

بالیں مدعا یہ نہ گرمِ خروش ہو
اے بانگِ مصلحِ عالم خموش ہو

جغرافیہ کا دل جو ہلا دے وہ چال چل
نقشوں کی ہر لکیر بگڑ جائے یوں مسل
تسخیرِ این و آں کو خدیوِ جہاں نکل
اے لوحِ عزم، ساحلِ آفاق پہ مچل

ہاں بامِ افتراق کو زیرِ کمند کر
اٹھ اور نوائے وحدتِ انساں بلند کر

قاتل بھی ہو رہا ہو اگر پیاس سے نڈھال
پانی اسے پلا کہ یہی ہے رہِ کمال
دشمن بھی گر رہا ہو تو ہاں دوڑ کر سنبھال
تھوکے بھی کوئی منہ پہ تو ماتھے پہ بل نہ ڈال

دل کی سپر پہ غیظ کا ہر وار روک لے
تا رِ نگاہِ لطف پہ تلوار روک لے

مندرجہ بالا بند میں تاریخی واقعات کو موضوع کے تحت سمویا گیا ہے حضرت امام حسینؑ نے سفرِ عراق میں قادسیہ کے مقام پر یزید کے پیاسے لشکر کو سیر و سیراب کیا تھا اور حضرت علی ابن ابی طالب نے عمرو ابن عبدود کو جب میدانِ کارزار میں زیر کر لیا تھا تو اس نے بے ادبی کی تھی اور لعابِ دہن آپ کے چہرۂ مبارک پر پھینک دیا تھا لیکن حضرت علی ابن ابی طالب نے عمرو ابن عبدود کو اس وقت چھوڑ دیا تھا۔ وحدتِ انسانی میں جوشؔ نے اسی جذبے کو منظوم کیا ہے اور مختلف حقائق و استدلال سے تمہید کو روحِ عنوان سے مربوط کر دیا ہے۔

"عظمتِ انسان" جوشؔ کا ایک ایسا مرثیہ ہے جس میں قلم کی عظمت و رفعت کو انتہائی خوبصورت انداز میں علمی وقار سے پیش کیا گیا ہے، واقعۂ "قرطاس" کو دنیائے شاعری میں پہلی بار جوشؔ نے نظم کیا ہے لیکن اشارے اور کنایے کی زبان استعمال کی گئی ہے اور اسی سے عظمتِ انسان کی طرف رجوع ہوئے ہیں۔ ان کا یہ نقطۂ نظر ہے کہ جب ذہنِ انسانی انسان کی رفعت اور انسانیت سے واقف اور آگاہ ہو جائے گا نگاہیں خود وحدتِ النفس و آفاق کو پالیں گی اور شریعت سمجھنے لگی کہ "تکدر" گناہ ہے۔ چاروں سمت یہی غلغلہ ہوگا کہ کوئی محبت والفت کا دشمن نہ بنے، دشمنِ انسان دشمنِ خدا قرار پائے گا اس مرثیہ کے چند بند نقل کیے جاتے ہیں:

اے قلم، چوبِ خضر، جبلِ متینِ ارشاد
شانۂ گیسوئے خمدارِ عروسِ ایجاد

قلزمِ وقت میں تو زمزمۂ بادِ مراد
تیری تاریخ میں بستی ہوئی صدیاں آباد
کرۂ خاک کے صد انوار و صد آثار کے ساتھ
رقص میں ہے تری پازیب کی جھنکار کے ساتھ

تو صدِ ناز جدھر سے بھی گزر جاتا ہے
جادۂ زیست کا ہر ذرہ سنور جاتا ہے
تو مہ و سال کی یورش سے نکھر جاتا ہے
ضربتِ وقت سے کچھ اور ابھر جاتا ہے

توڑ دیتی ہے چٹانوں کو روانی تیری
رس پہ آتی ہے بڑھاپے میں جوانی تیری

تیری ٹھوکر پہ سرِ قیصر و تاجِ فغفور
تیری مضطرب حرکت لرزشِ مژگانِ شعور
تیری آغوش میں ہے آبِ خضر و آتشِ طور
تیرے سینے میں شبِ قدر و نمِ صبحِ ظہور

معتبر ہے جو گواہی سو گواہی تیری
صبحِ صادق کا سپیدہ ہے سیاہی تیری

اے قلم مسئلہ میزان و معارف مقیاس
علم بنیاد و ہنر پرور و ادراکِ اساس
فکر پیما و نظر ناقد و فرہنگ شناس
مشعلِ فکرِ ادب، مشرق، صبحِ قرطاس

نام تیرا سببِ جنبشِ لب ہائے رسول ﷺ
اے قلم موت کے لمحے کی تمنائے رسول ﷺ

اے قلم نور فشاں ہو کہ دمک جائے زمیں

ظلمتِ وہم میں ضو بار رہو خورشیدِ یقیں
حیف اس دورِ جواں پر کہ بہ ایں عقلِ مبیں
آدمی کی عظمت کا اسے اندازہ نہیں
حسنِ ارضی پہ سماوات کو شیدا کر دے
آدمی کیا ہے یہ دنیا پہ ہویدا کر دے

آدمی صاحبِ گیتا و زبور و قرآں
کفر ہے اس کی صباحت تو ملاحت ایماں
بانیِ دیر و حرم واضعِ ناقوس و اذاں
خالقِ اہرمن و وجہِ حروفِ یزداں
یہ جو عیب و ہنر و زشتی و زیبائی ہے
فقط انسان کی ٹوٹی ہوئی انگڑائی ہے

آدمی، حافظ و خیام و انیس و عرفی
غالب و مومن و فردوسی، میر و سعدی
خسرو و رومی و عطار و جنید و شبلی
یونس و یوسف و یعقوب و سلیماں و علی
خطبۂ حضرتِ خلاق کا منبر انساں
انتہا یہ کہ محمد سا پیمبر انساں

اپنے یاروں کی محبت ہے مزاجِ انساں
آپ بھی اپنے رفیقوں پر ہیں گوہر افشاں
دل سا تھا شمر بھی اپنے رفقا پر قرباں
آپ اور شمر ہیں اس سطح پہ بالکل یکساں
ہاں جو دل میں چمنِ حبِ عدو کھل جائے

آپ کو سطحِ حسین ابنِ علیؑ مل جائے

اس کے بعد رفتہ رفتہ گریز کرتے ہیں۔ یہ مرثیہ جوشؔ کا نمائندہ مرثیہ ہے۔ وہ استدلالی انداز سے کام لیتے ہیں جس سے موضوع کے ساتھ مضمون بھی آفاقی نقطۂ نظر کا حامل ہو جاتا ہے۔ واقعات، احادیث اور آیات کے بلیغ اشارے جوش کی مرثیہ نگاری کا خاص وصف ہیں لیکن ان کے مراثی کی سب سے بڑی صفت سماجی اور سیاسی شعور و احساس ہے۔

یوں تو جوشؔ کی شاعری کے سبھی اصناف میں ان کا بیدار سماجی سیاسی اور انقلابی شعور اور قومی احساس ملتا ہے لیکن مراثی میں واقعۂ کربلا کے پس منظر میں وہ اس موضوع کو بھرپور بالیدگی عطا کرتے ہیں وہ برطانوی دورِ حکومت میں بھی " حسین اور انقلاب " جیسا مرثیہ لکھ کر حکمراں طبقے کے جبر و تشدد، سفاکیت اور بہیمیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور بعد میں بھی ظلم و جبر و بربریت، قصر سلطنت و حکومت، تاج و سطوت کے خلاف کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ کے لیے اذہان کو بیدار کرتے ہیں، جذبات کو جھنجھوڑتے ہیں، تازیانہ لگاتے ہیں، عبرت کا نقشہ پیش کرتے ہیں اور " عظمتِ انسانی " کا عرفان کراتے ہیں۔

جوشؔ، عصرِ حاضر کے یزیدانِ نو کی شناخت کراتے ہیں اور حسینیت کی روح پیش کرتے ہیں۔ ڈرامائی اور مکالماتی انداز سے انھوں نے اپنے مرثیوں میں روحِ عصر کو جذب کرلیا ہے۔ مظلومیت کا تحفظ اور ظلم سے جنگ، جوشؔ کی مرثیہ نگاری کا اہم موضوع ہے۔ جسے وہ تاریخی اور مذہبی تشبیہات و استعارات اور منطقی استدلال سے نظم کرتے ہیں

آج کے دور میں ہوش ربا گرانی بدامنی اور بے سکونی کی کیفیت بھی ان کے مرثیوں میں ملتی ہے۔ سرمایہ داری، جنگِ زرگری، امارت پرستی اور مادی شخصیتوں کے بت جوشؔ کے مراثی میں توڑے جاتے ہیں۔ دراصل جوشؔ کا قلم حق و صداقت کی ایک ایسی شمشیرِ آبدار ہے جو عدل وانصاف کی نیام میں رہتا ہے جس سے وہ معاشرے کے گھناؤنے پردوں کو چاک چاک کر دیتے ہیں۔ چند مقامات ملاحظہ ہوں:

مجروح پھر ہے عدل و مساوات کا شعار
اس بیسویں صدی میں ہے پھر طرفہ انتشار
پھر نائبِ یزید ہیں دنیا کے شہریار
پھر کربلائے نو سے ہے نوعِ بشر دوچار

اے زندگی! جلالِ شہِ مشرقین دے
اس تازہ کربلا کو بھی عزمِ حسین دے

پھر گرم ہے فساد کا بازار دوستو
سرمایہ پھر ہے بر سرِ آزار دوستو
تاکے یہ خوفِ اندک و بسیار دوستو
تلوار ہاں اٹھی ہوئی تلوار دوستو

جو تیز تر ہو خوانِ امارت کو چاٹ کر
رکھ دے جو سیم و زر کے پہاڑوں کو کاٹ کر

بل کھا رہے ہیں دہر میں پھر سیم و زر کے ناگ
گونجے ہوئے ہیں گنبدِ گرداں میں غم کے راگ
پھر موت رخشِ زیست کی تھامے ہوئے ہے باگ
تا آسماں بلند ہو اے زندگی کی آگ

فتنے کو اپنی آنچ کے جھولے میں جھونک دے
ہاں پھونک دے قبائے امارت کو پھونک دے

جوش کے نزدیک رعبِ سلطانی کو ٹھکرانا، تعمیرِ ظلم کو ڈھا دینا، حریتِ انسانیت کو محفوظ رکھنا ہی حسینیت ہے اور جوش اسے انقلابی شعور اور احساس کی روشنی میں پیش کرتے ہیں :

رعبِ سلطانی کو ٹھکراؤ تو لو نامِ حسینؑ
بولتے رن میں گھبراؤ تو لو نامِ حسینؑ
دشمنوں کی پیاس بجھواؤ تو لو نامِ حسینؑ
موت کی چھاتی پہ چڑھ جاؤ تو لو نامِ حسینؑ
حلق سے تیغوں کا منہ موڑ دو تو لو نامِ حسینؑ
برگ سے فولاد کو توڑ دو تو لو نامِ حسینؑ

خود پہ بابِ تشنگی کھولو تو لو نامِ حسینؑ
دل کو برقِ رعد میں تولو تو لو نامِ حسینؑ
دوستدارِ دشمناں ہو لو تو لو نامِ حسینؑ
تیغ کے نیچے کبھی سچ بولو تو لو نامِ حسینؑ
ظلم کی تعمیر کو ڈھا دو تو لو نامِ حسینؑ
شمع سے آندھی کو ٹکرا دو تو لو نامِ حسینؑ

عزتِ دستور پر جو سر کٹا سکتا نہیں
جو خود اپنے ہی چراغوں کو بجھا سکتا نہیں
تان کر سینے کو جو میداں میں آ سکتا نہیں
موت کو جو اپنے کاندھے پر اٹھا سکتا نہیں
ہاں، بخود اپنے خون میں کشتی جو کھے سکتا نہیں

وہ حسین ابن علی کا نام لے سکتا نہیں

ہو نکتا پھرتا ہے پھر سرمایہ داری کا وقار
اٹھ چکا ہے پھر عوامی برتری کا اعتبار
پھر خزاں کی آستاں بوسی پہ ہے نازاں بہار
پھر خدا کا ذوقِ تخلیقِ لبشر ہے شرمسار
پھر زبوں ہے نفسِ انسانی کی حالت یا حسینؑ
آ کہ پھر دنیا کو ہے، تیری ضرورت یا حسینؑ

جہل پھر رکھے ہوئے ہے علم کے سر پر قدم
خاک میں پھر مل چکا ہے آدمیت کا بھرم
زندگی پہ مارتے پھرتے ہیں ٹھوکریں پھر درم
کھل چکا ہے پھر دلِ انساں میں صنمے کا علم
پھر دفِ زر بج رہا ہے شور ہے اشرار کا
صف شکن یہ وقت ہے پھر تیغ کی جھنکار کا

دیکھ پھر قصرِ جہنم بن چکا ہے روزگار
آنچ میں غلطیدہ ہے پھر خیمۂ لیل و نہار
سر زمیں پر حکمراں ہے با ہزاراں اقتدار
آتشِ دود و دخان و شعلہ و برق و شرار
زندگی ہے بر سرِ آتش فشانی یا حسینؑ
آگ دنیا میں لگی ہے آگ، پانی یا حسینؑ

یعنی زمیں پہ فتنہ ہو جب وقت بار بار
انسانیت کے صحن میں اڑنے لگے غبار

آئینِ اجتماع میں پیدا ہو انتشار
ساکن معاشرہ میں تزلزل ہو آشکار

اور یہ نظر پڑے کہ زمیں داد خواہ ہے
اس وقت خوئے مہر و محبت گناہ ہے

توڑے ہر ایک شاخ، بچھڑے ہر ایک پھول
ولنے لگے علوم، کھرچنے لگے عقول
ڈھانے لگے حقوق، دھنکنے لگے اصول
بونے لگے ظلوم، اگانے لگے جہول

کھینے لگے نمائشِ جاہ و جلال کو
سینے لگے تصورِ جنگ و جدال کو

محلوں میں جلوہ ریز ہوں ارذالِ خیرہ سر
چالاک رہزنوں کو ملے منصبِ خضر
سفلوں کو ہو نشست سرِ تختِ سیم و زر
اقطابِ روزگار کے بستر ہوں خاک پر

آئے اجل عوام کی جانوں کے واسطے
دنیا ہو صرف چند گھرانوں کے واسطے

جہال کی زبان پہ ہوں لن ترانیاں
اشرارِ خود غرض کو ملیں حکمرانیاں
برسیں حقیقتوں کی زمیں پہ کہانیاں
کھانے لگیں عوام کا گودا گرانیاں

سفلوں سے بھیک اہلِ سخا مانگنے لگیں
مرنے کی اہلِ علم دعا مانگنے لگیں

ہاں جوشؔ اب پکار کہ اے میرِ کربلا

اس بیسویں صدی کی طرف بھی نظر اٹھا
ہاں دیکھ یہ خروش، یہ ہلچل، یہ زلزلہ
اب سینکڑوں یزید ہیں، کل اک یزید تھا

طاقت ہے حق، ہے شور رہے یہ گاؤں گاؤں میں
زنجیر پڑ رہی ہے، پھر انساں کے پاؤں میں

پھر جنگ وجبر وجور پہ انساں کو ناز ہے
پھر آدمی پلنگ ہے کرگس ہے باز ہے
دل میں علیلِ ذوقِ ہوس چارہ ساز ہے
پھر حبِ اقتدار کی رسّی دراز ہے

ذاتی مفاد پہ ہیں تُبک سر اڑے ہوئے
چاندی کے پھر کھنور ہیں رگوں میں پڑے ہوئے

جوشؔ نے حبِ اقتدار کی مذمت کی ہے اور بیسویں صدی میں بڑھتی ہوئی جنگ کی لے برتری اور سیاسی رَو کو آسانی سے سمجھایا ہے اور "طاقت ہی حق ہے" کے مروّج محاورے پر ضرب کاری لگائی ہے۔ انسان کس قدر حرص وہوس اور منصب وجاہ کا پتلا بن گیا ہے اس کے سینے تو خزف ریزوں سے پُر ہیں مگر زبانیں منافقت میں گہر بدوش ہیں، سفہا جہلا اور سفلہ پروردوں کو اقتدار حاصل ہے مگر علماء فضلاء اور صادقین خاک نشین ہیں، جوشؔ نے اپنے مراثی میں اس طرح کے تلخ حقائق پرطی کامیابی اور چابک دستی سے نظم کیے ہیں لیکن "مرثیت" باقی رکھی ہے۔

حسینیت کی روح اور حسینی پیغام، جوشؔ نے بہت ہی متانت سے پیش کیا ہے، انھوں نے ہمارے کردار کو بھی آئینہ دکھلایا ہے۔ اور

اظہار تاسف کیا ہے کہ جب قوم کے راہبر حسینؑ جیسے بلند کردار انسان ہوں، وہ قوم خستہ حال و پریشان و حیران ہو۔ جوش کردارِ حسینؑ اور عزمِ حسینؑ کا واسطہ دے کر جذبۂ عمل اور جرأت و حق گوئی اور بے باکی کے ساتھ حصولِ حق کی ترغیب دیتے ہیں۔ چند بند پیش کیے جاتے ہیں:

حیف جس قوم کا سلطان ہو ایسا انساں
وہ رہے خستہ پریشان، معطل حیراں
نہ شررِ بار ترنگیں، نہ دہکتے ارماں
جس کی آنکھیں فقط آبادہوں سینے ویراں

ہمت و جرأت و ایثار و وفا کچھ بھی نہیں
ذکرِ مولا پہ کراہوں کے سوا کچھ بھی نہیں

زندگی شعلۂ جوالا ہے گل زار نہیں
موت کا گھاٹ ہے یہ مصر کا بازار نہیں
اپنے آقا کی تاسی پہ جو تیار نہیں
زندہ رہنے کا وہ انسان سزاوار نہیں

جو حسینی بھی ہے اور موت سے بھی ڈرتا ہے
ہاں وہ توہینِ حسینؑ ابن علیؑ کرتا ہے

جہلا جب کلمۂ علم کو ٹھکراتے ہیں
علمائے دین کو جب بیچ کے کھا جاتے ہیں
سفہا دولتِ فانی پہ جب اتراتے ہیں
جو حسینی ہیں وہ میدان میں نکل جاتے ہیں

دھجیاں دامنِ دولت کی اڑا دیتے ہیں
بادِ صرصر کو چراغوں پہ نچا دیتے ہیں

میں یہ پوچھوں جو خفا ہوں نہ رفیقانِ کرام

کہ لرزتے تو نہیں آپ حضورِ حکام
آپ سرکار میں جھکتے تو نہیں بہرِ سلام
آنکھ شاہوں سے ملاتے ہیں بہ اندازِ امام
رائے بکتی تو نہیں آپ کی بازاروں میں
آپ کا رنگ تو اڑتا نہیں درباروں میں

آپ کا آلِ محمدؐ سے جدا ہے دستور
قابلِ غور نہیں مسئلہ شرحِ صدور
آپ کا شغل ہے کوئی تو فقط کشفِ قبور
آپ کو پیرویِ شبیرِ خدا نا منظور
آپ تو شمعِ رہ و رسم کے پروانے ہیں
دوش پر کعبہ ہے سینوں میں صنم خانے ہیں

کربلا اب بھی ہے اک ہوش ربا انگارا
اپنے پانی میں لیے آگ کا جولاں آرا
برق و آتش کا ابلتا ہوا اک فوارا
ایک مڑتا ہوا خونِ شہدا کا دھارا
رنگ اڑتا نظر آتا ہے جہاں داروں کا
مینہ برستا ہے یہاں آج بھی تلواروں کا

کربلا آج بھی ہے ایک لگاتار پکار
ہے کوئی پیرویِ ابنِ علیؑ پر تیار
عصرِ حاضر کے یزیدوں کا نہیں کوئی شمار
تم مصلّوں پہ دوزانو ہو مسلّح اشرار
شورِ ماتم میں کہیں تیغ کی جھنکار نہیں
لب پہ نالے ہیں مگر ہاتھ میں تلوار نہیں

کربلا اب بھی حکومت کو نگل سکتی ہے
کربلا تخت کو تلووں سے مسل سکتی ہے
کربلا خار تو کیا، آگ پہ چل سکتی ہے
کربلا وقت کے دھارے کو بدل سکتی ہے

کربلا قلعۂ فولاد ہے جراروں کا
کربلا نام ہے چلتی ہوئی تلواروں کا

کربلا ایک تزلزل ہے محیطِ دوراں
کربلا خرمنِ سرمایہ پہ ہے برقِ تپاں
کربلا طبل پہ ہے ضربتِ آوازِ اذاں
کربلا جرأتِ انکار ہے پیشِ سلطاں

فکرِ حق سوز یہاں کاشت نہیں کر سکتی
کربلا تاج کو برداشت نہیں کر سکتی

جب تک اس خاک پہ باقی ہے وجودِ اشرار
دوشِ انساں پہ ہے جب تک حشم تخت کا بار
جب تک اقدار سے اغراض ہیں گرمِ پیکار
کربلا ہاتھ سے پھینکے گی نہ ہرگز تلوار

کوئی کہہ دے یہ حکومت کے نگہبانوں سے
کربلا ایک ابدی جنگ ہے سلطانوں سے

جوش نے اپنے مرثیوں میں اس پہلو پر کافی زور دیا ہے کہ کربلا کے واقعہ کی اصل غرض و غایت پر غور و فکر کرنا ضروری ہے۔ مقصد شہادت حسینؑ کو سمجھے بغیر واقعہ کربلا کی تفہیم مشکل ہوگی۔ انہوں نے جاگیردارانہ نظام، جابرانہ حیات اور بے کسوں، مزدوروں، بے بسوں اور مظلوموں کے استحصال کے

خلاف نعرۂ بغاوت ہمیشہ بلند کیا ہے، لیکن مرثیوں میں یہ نظریہ زیادہ کھل کر بروئے کار آیا ہے، اس لیے کہ وہ سماج اور شاعری کے رشتے کی نزاکت اور افادیت کے بہت بڑے نقیب ہیں۔ جوشؔ کربلا کو سلطانوں سے ایک ابدی جنگ قرار دیتے ہیں اور اس کی توثیق کرتے ہیں کہ کربلا غرورِ تخت و تاجِ حکومت کو برداشت نہیں کرسکتی ہے۔ اس لیے معیارِ کربلا اور روحِ شہیدِ کربلا ابدیت کا حامل ہے۔ اسی لیے یزیدانِ عصرِ حاضر اور نمرودانِ دورِ حاضر سے بھی نبرد آزما ہونے کی ترغیب دیتے ہیں:

پھر تمدن کی طرف پھنکار کر جھپٹے ہیں ناگ
جل رہا ہے پھر عروسِ زندگانی کا سہاگ
کامنی راتیں صدائیں دے رہی ہیں آگ آگ
جاگ اے ابنِ علیؑ کے نوحہ خوانِ خفتہ جاگ

اٹھ بھڑکتی آگ کو پانی بنانے کے لیے
کربلا آئی ہے بالیں پر جگانے کے لیے

اے برادر تجھ کو اکبر کی جوانی کی قسم
جو ہوا تھا بند اس مقتل کے پانی کی قسم
ناتواں عابد کی بیڑی کی گرانی کی قسم
زینبِ خوددار کی آتش بیانی کی قسم

غرق کردے بجلیاں، مردانگی کے راگ میں
کود پڑ نمرودِ حاضر کی بھڑکتی آگ میں

آج پھر دنیا میں ہے انسان کی مٹی پلید
ڈاکوؤں کی جیب میں ہے عصرِ حاضر کی کلید
ہاں یہ جذباتِ جہاں سوز و بہ ضرباتِ شدید
آج پھر بیعت طلب ہیں عصرِ حاضر کے یزید

فوجِ باطل شاد ہے، سیراب ہے، خورسند ہے
ہاں مگر اہلِ حق پہ سنتے ہیں کہ پانی بند ہے

دارا، ہلچل ہے پھر برپا میانِ مشرقین
ہر نظر ہے ایک ماتم ہر نفس ہے ایک بین
تخت پر سرمایہ داری ہے بصد اجلال و زین
اور ٹس سے مس نہیں ہوتے محبانِ حسینؑ

ہے یہی ایمان تو ایمان کو میرا سلام
اک فقط ایمان کیا قرآن کو میرا سلام

مراثی جوشؔ میں بینیہ عناصر کی کمی ہے لیکن وہ اس پہلو کو بہت اختصار کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں جس میں غضب کی تاثیر رہتی ہے وہ تفصیل میں تو نہیں جاتے مگر اجمال میں بھی کچھ ایسی اثر آفرینی رہتی ہے کہ رقت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ بھی جوشؔ کی مرثیہ نگاری کی خاص صفت ہے جو ان کے ہم عصر مرثیہ نگاروں کو حاصل نہیں۔ جوشؔ کا ایک مرثیہ "پانی" کے عنوان سے ہے ان کے ایک اہم ہم عصر مرثیہ نگار نسیمؔ امروہی نے بھی اسی عنوان سے ایک مرثیہ سپردِ قلم کیا ہے۔ لیکن دونوں مرثیوں میں بڑا فرق ہے زبان و بیان، جدتِ ادا، ندرتِ خیال، شدتِ جذبات، تشبیہات و استعارات، روحِ عصر اور مزاج کے علاوہ بین میں بھی واضح فرق نمایاں ہے ذیل میں نسیمؔ امروہوی اور جوشؔ کے بند مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

جو کچھ نہ دے کوئی اس کو بذلت و خواری
وہ غم میں ہو تو کرے پھر اس کی غم خواری
ہر ایک کا فرد مسلم سے ہے رواداری
نبیؐ و آلِ نبیؐ کا یہ فیض ہے جاری

جنابِ فاطمہ زہرا کا مہر ہے پانی
جو ان سے بغض رکھے اس کو زہر ہے پانی

تمام حاکم و محکوم و منعم و نادار
تمام کافر و دیں دار و زاہد و بدکار
وحوش و طیر و بز و گرگ، و مرکب و اسوار
ہیں بے مزاحمت، اس وقفِ عام سے سرشار
روا ہر اک کے لیے بے گزند ہے پانی
مگر حسین کے بچوں پہ بند ہے پانی

یہ تین روز کے پیاسے کھڑے ہیں ڈیوڑھی پر
شباب پر ہے تمازت، سموم کا ہے گزر
بھبک رہی ہیں فضا میں، برس رہے ہیں شرر
فرات سامنے ہے پی رہا ہے سب لشکر
قیامت اور یہ بچوں پہ ڈھا رہے ہیں شقی
دکھا کے پیاس میں پانی بہا رہے ہیں شقی
نسیم امروہوی [۱]

اب جوش کے بند ملاحظہ ہوں :- ؎
برکھا کا راگ گائے تو ساغر چھلک اٹھیں
چھیڑے جو دھوم سے تو شبستاں لہک اٹھیں
رس بوندیاں گرائے تو پتے کھنک اٹھیں
کوثر میں گنگنائے تو حوریں تھرک اٹھیں

---

[۱] مراثی نسیم جلد دوم ص ۴۲، ۴۳

پہنچے جو عرش پر تو ملک سشت شو کریں
زلفیں نچوڑ دے تو پیمبر وضو کریں

صد حیف کربلا میں وہی آبِ خوش گوار
جس پر حیاتِ نوعِ بشر کا ہے انحصار
جس کے بغیر آتشِ سوزاں ہے روزگار
بجتا ہے جس کے تار پہ انفاس کا ستار

جس کا عَلَم ہے بارگہِ مشرقین پر
اہلِ جفا نے بند کیا تھا حسینؑ پر

اس حادثے پہ آج بھی گریاں ہے بحر و بر
اللہ یہ تلاطمِ شر ہول جوئے شر
یہ اُفِ الحفیظ ، یہ عدوان الحذر
پانی سی چیز بند ہے وہ بھی حسینؑ پر

مولا کسی پہ کوئی نہ ایسی جفا کرے
کافر پہ بھی نہ بند ہو پانی خدا کرے

نسیم امروہوی نے اپنے مرثیے میں بینیہ پہلو کو بہت طول دیا ہے مگر جوش نے اختصار کے ساتھ جو تاثر پیدا کر دیا ہے وہ نسیم کے یہاں نہیں۔ اسی طرح اور بھی کچھ مرائی کے بینیہ بند جستہ جستہ پیش کیے جاتے ہیں۔ جس سے یہ واضح ہو جائے کہ جوش بین کو بھی نظم کرنے پر قادر تھے مگر ان کا نظریہ ہی مختلف تھا: ۵

چشمِ نم ناک میں تھا پرتوِ روئے بے شبیر
سانس لیتے تھے تو چبھتا تھا جگر میں اک تیر

برق جو آنکھ کی تھی موجِ ہوا میں تاثیر
اور اس نقطۂ حدّت پہ کھڑے تھے شبیر

کہ جہاں دھوپ کچھ اس طور سے برسانی ہے
سینۂ برف سے بھی آنچ نکل آتی ہے

اے گلوئے زیرِ شمشیرِ عدو تجھ پر سلام
کربلا کی خاک پر بہتے لہو تجھ پر سلام
دودمانِ مصطفےٰ کی آبرو تجھ پر سلام
اے بخونِ غلطیدہ زلفِ مشک بو تجھ پر سلام

دینِ اہلِ درد و جانِ اہلِ ماتم السّلام
شانۂ ایمان کے اے گیسوئے برہم السّلام

سینۂ مسلم کے سوزِ نہانی کو سلام
نوسن ابن مظاہر کی روانی کو سلام
اصغرِ معصوم تیری بے زبانی کو سلام
اکبرِ نوخیز تیری نوجوانی کو سلام

مصطفےٰ کے لال کو حیدرؑ کے پیارے کو سلام
فاطمہؑ زہرا تری آنکھوں کے تارے کو سلام

تھی جس کے دوشِ پاک پر اہلِ ولا کی لاش
انصار سرفروش کی لاش اقربا کی لاش
عباسؑ سے مجاہدِ تیغ آزما کی لاش
قاسم سے شاہ زادۂ گل گوں قبا کی لاش

پھر بھی یہ دھن تھی صبر کی زلفوں سے بل نہ جائے
اس خوف سے کہ حق کا جنازہ نکل نہ جائے

زار و نزار و تشنہ و مجروح و ناتواں
تنہا کھڑا ہوا تھا جو لاکھوں کے درمیاں
گھیرے تھے جس کو تیر و تبر ناوک و سناں
اور سو رہا تھا موت کے بستر پہ کارواں

اتنا نہ تھا کہ حق رفاقت کے کام سے
گرنے لگیں اگر تو کوئی بڑھ کے تھام لے

ہاں وہ حسینؑ خستہ و مجروح و ناتواں
ساکت کھڑا ہوا تھا جو لاشوں کے درمیاں
سنتا رہا سکون سے جو پیرِ نیم جاں
اکبر سے ماہ رو کی جوانی کی ہچکیاں

ہے ہے کی آ رہی تھی صدا کائنات سے
پھر بھی قدم ہٹائے نہ راہِ ثبات سے

تو اور تیرے حلق پہ تلوار ہائے ہائے
زنجیر اور عابدِ بیمار ہائے ہائے
زینبؑ کا سر کھلے سرِ بازار ہائے ہائے
سر تیرا اور یزید کا دربار ہائے ہائے

انسان اس طرح اتر آئے عناد پر
لعنت خدا کی حشر تک ابنِ زیاد پر

جوش کے پیش نظر نام حسینؑ آلام و مصائب کی ایک طویل فہرست ہے۔ اس لیے لبوں پہ نام حسینؑ کے آتے ہی ذہنوں میں ان پہ ظلم و ستم کے ڈھائے جانے والے کوہِ گراں کا نقشہ پھر جاتا ہے اور بے ساختہ آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں اور یادِ مظلومیِ حسینؑ شام و سحر کے درمیان بسی رہتی ہیں۔

دل میں تیری یاد ہے شام و سحر کے درمیاں
زمزموں کے ہیں سفینے ہچکیوں کے درمیاں
لب پہ نغموں کی دمک ہے آنکھ سے آنسو رواں
فصلِ گُل کی دھوپ میں پڑتی ہیں جیسے بوندیاں

تجھ پہ بے روئے نہیں اٹھتے کسی محفل سے ہم
کیا کریں مجبور ہو جاتے ہیں اپنے دل سے ہم

ہم سے یہ کہتی ہے تیری کامرانی اے حسینؑ
کامرانی ہے محلِّ شادمانی اے حسینؑ
شادمانی ہے متاعِ زندگانی اے حسینؑ
آنسوؤں کی پھر بھی ہوتی ہے روانی اے حسینؑ

زمزموں کو چشمِ گریاں میں ڈبو دیتا ہے دل
جب ہنسی ہونٹوں پہ آتی ہے تو رو دیتا ہے دل

دارو گیرِ کربلا پر اے شہیدِ محترم
عقل نازاں ہے مگر جذبات کی آنکھیں ہیں نم
چونکہ تیرے جذبۂ نصرت میں ہے ہم آہنگ غم
اس لیے آنسو چڑھاتے ہیں تری بالیں پہ ہم

دل کا یہ فرمان ہے لغزش نہ آئے پاؤں میں
جشنِ فتحِ کربلا ہو، آنسوؤں کی چھاؤں میں

جوشؔ نے جوازِ گریہ اور فلسفۂ گریہ کی روشنی میں اپنے مراثی میں اشک افشانی کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ یہ آنسو ایسے ہوں جو شرارِ زندگی کی بارش کریں اور جس کی بوندوں سے زندگی کے عزت و وقار کے گہر ہائے آبدار سکیں۔ غمِ حسینؑ میں آنکھوں سے یہ ٹپکنے والے آنسو شادابیٔ اہلِ جہاں

کا باعث بنیں اور غرورِ خسروی کے جور و استبداد کے سفینوں کو غرق کر دیں۔
وہ بازو جو غمِ شبیر میں سینہ کوبی کر رہے ہیں انھیں حقوقِ نوعِ انسانی کے لیے
بھی بلند ہونا ضروری ہے تاکہ جب غرورِ اقتدار، اقدارِ حیات پر چھانے لگے،
تو ان ہاتھوں سے آئینِ خسروی پر آگ برسائی جا سکے۔

مراثیِ جوش میں عصرِ حاضر کے تقاضے بھی ہیں اور قدیم تاریخ کے حوالے بھی۔ تاریخِ اسلام کے واقعات جدید ذہنی تقاضوں کی روشنی میں نظم کیے گئے ہیں۔ ان کا تصورِ انقلاب مرثیوں میں بھی نمایاں ہے جس میں روحِ حسنِ تعمیرِ معاشرت مضمر ہے۔ ان کی تشبیہات، استعارات اور تمثیلات میں ہندی زبان و ادب کا بھی گہرا اثر ملتا ہے۔ ان تشبیہات و استعارات کو جوش حاکمانہ انداز میں استعمال کرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمثیلات انھیں کے لیے خلق کی گئی ہیں۔

ظاہر ہے کہ عہدِ میر انیس تک مرثیہ جتنی ارتقائی منزلیں طے کر چکا تھا اس میں اسی ہیئت میں اضافہ ناممکن تھا اس لیے جوش نے اس صنفِ سخن میں نئی راہ نکالی اور مرثیے کو صرف ہم پلۂ عبادت ہی نہیں بلکہ حیاتِ انسانی اور شرافتِ انسانی کے تقاضے اور معیار کے جملہ امکانات کو احاطہ کیا، صلحِ کل اور انسان دوستی کے اعلیٰ نمونے پیش کیے اور مرثیے کے مزاج کو بالیدگی عطا کر دی ہے۔

بدلے کی رسم دینِ وفا میں حرام ہے
احسان اک شریف ترین انتقام ہے

دراصل جوش نے اردو مرثیے کو دینِ وفا، احسان اور شرافت کی نئی روح عہدِ حاضر کے تناظر میں بخشی ہے۔

چھ

نثرِ نگاری

ایک بڑے مفکر کا یہ نقطۂ نظر ہے کہ کسی زبان کے ادبی سرمایے کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کے نثری کارناموں سے کیا جاتا ہے اس اعتبار سے اردو نثر آج اتنی زیادہ ترقی کرنے کے باوصف شاعری کے مقابلے میں کم تر دکھائی دیتی ہے۔ خدا بھلا کرے جنوبی ہند کے اہلِ قلم حضرات کا، جنھوں نے صرف شاعری کو ہی نہیں اپنایا، بلکہ نثر نگاری کو بھی شاعری کے دوش بدوش فروغ دیا۔ ورنہ اگر شمالی ہند کی نثر نگاری پہ بھروسہ کر لیا جاتا تو اردو نثر کی تاریخ کافی پس لپشت پڑ جاتی۔ جنوبی ہند کے نثری کارناموں کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو نثر بھی کم از کم پانچ سو سال سے زیادہ تاریخ کی مالک ہے۔ اس طویل عرصہ میں اردو کے نثری آہنگ میں بہت سے تغیرات اور ترک و قبول کے عمل جاری رہے اور نثر کی ضرورت و افادیت کے احساس میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ اس لیے مختلف اسالیب نثر عالم وجود میں آئے اور شمالی ہند کے شعراء میں نثر نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔ جوش بھی اپنے کو نرا شاعر نہیں کہلانا چاہتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے بھی نثر کو اپنایا ہے گو کہ وہ اول اور آخر شاعر ہیں مگر نثر میں بھی ان کا مخصوص انداز ہے۔ ۱۹۲۰ء میں سب سے پہلے ان کی نثر کے نمونے "روحِ ادب" میں ملتے ہیں جس سے ان کی نثر نگاری کی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ "روحِ ادب" پر تبصرہ کرتے ہوئے مولوی عبدالحق صاحب تحریر کرتے ہیں:

"روحِ ادب ـــــ منشی شبیر حسن خاں صاحب جوش کے نثر و نظم کے مجموعے کا نام ہے۔ حضرت جوش، سنجیدہ پرجوش اور جدّت پسند شاعر اور

نثار ہیں۔ نثر میں جا بجا جدت سے کام لیا ہے اور فرضی تصویروں میں اصلیت کا رنگ دکھایا ہے۔ استعارات و تشبیہات کی اس قدر بہتات ہے کہ مسلسل پڑھنے سے جی اکتا تا ہے اور کتاب ہاتھ سے رکھ دینی پڑتی ہے۔ طرزِ تحریر کے ساتھ خیالات میں کچھ نوکھاپن دکھایا ہے، لیکن ان میں تہہ کم ہے۔ بعض جگہ ٹیگور کا تتبع کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں کامیابی ہوئی ہے لیکن اکثر جگہ ناکامی نظر آتی ہے اور مضمون پھیکا اور سپاٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ کامیابی کی ایک مثال "شاید وہ آجائے" کے مضمون میں صاف نظر آتی ہے۔ بعض مقامات پر عبارت میں خامی معلوم ہوتی ہے اگرچہ وہ زیادہ قابلِ لحاظ نہیں تاہم نہ ہوتی تو بہتر ہوتا۔ مثلاً "عجیب شربتی" کا پہلا جملہ "ایک رنگین عارضوں والی دوشیزہ ....
جوش صاحب نے نثر میں بعض انگریزی انشاپردازوں کی تقلید کی ہے مگر یہ طرزِ تحریر خاص خاص مضامین کے اظہار کے لیے موزوں ہو سکتا ہے۔ ہر جگہ کام نہیں آسکتا اور اس کے نبھانے کے لیے علاوہ زبان کی قدرت کے خیال کی بلندی بھی درکار ہے اس مجموعے کے مختلف مضامین پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی پہلی مشق ہے مگر تاہم اس میں کامیابی اور کمال کی جھلک نظر آتی ہے ......
ان کی نثر میں تصنع اور تکلف کا دخل زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ حصولِ کمال کے لیے اس سے بچنا ضروری ہے۔" [۱]

پروفیسر آلِ احمد سرور، جوش کی نثر نگاری کے متعلق رقم طراز ہیں:
"جوش کی شاعری کی قدر و قیمت ضروری ہے مگر ان کی نثر ایک قسم کی سِسر پا ہے۔" [۲]

مندرجہ بالا آراء سے مکمل طور پر اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دونوں رائیں

---

[۱] ادبی تبصرے۔ عبدالحق ص ۵ و ۶ سنہ ۱۹۶۲ء طبع دوم۔ دانش محل۔ لکھنؤ

[۲] درس علی گڑھ ص ۲۲ اپریل، مئی ۱۹۵۶ء

اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ ان دونوں اصحاب نے جوشؔ کی نثر نگاری کا بھرپور جائزہ نہیں لیا ہے بلکہ ہنگامی تاثرات اور ذہنی تحفظات کی روشنی میں قلم کو جنبش دی گئی ہے۔ صرف ایک آدھ جملے میں کوئی بات ادا بھی نہیں ہو سکتی "روحِ ادب" میں نثر سے متعلق چند اوراق ہیں اس سے ان کی نثر نگاری کا احاطہ کرنا سراسر ناانصافی ہے۔ پروفیسر آل احمد سرورؔ نے جو رائے ظاہر کی ہے۔ وہ دراصل اضطراری نوعیت کی ہے اس لیے کہ جوشؔ نے فانی بدایونی کے کلام پر سخت تبصرہ کرتے ہوئے انہیں "بیوۂ عالم، سوز خواں اور ہر وقت بسورنے والا" شاعر قرار دیا تھا۔ چنانچہ پروفیسر آل احمد سرور کی رائے ردِ عمل کے ذیل میں آتی ہے۔

جوشؔ کے نثری افکار کا مطالعہ اس نتیجے تک آسانی سے پہنچاتا ہے کہ ان کا طرزِ نگارش منفرد اور ممتاز ہے وہ کسی کی تقلید گوارا نہیں کرتے۔ ان کی پہلی نثری تصنیف "اشارات" "یادوں کی برات" اور "خطوط" وغیرہ اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ جدت طرازی میں یقین رکھتے ہیں۔ ان کے مزاج کی رومانیت، شگفتگی، رندی اور انقلابی رویہ ان کی تحریروں میں ابھرا پڑا ہے نثر میں بھی وہ نادر تشبیہات واستعارات اور محاکات سے کام لیتے ہیں جس سے جذبے کی ایک خاص کیفیت بیان ہو جاتی ہے۔

جوشؔ اردو ادبیات میں انقلاب پیدا کر دینا چاہتے تھے ماہنامہ "کلیم" دہلی میں ان کے قلم سے نکلے ہوئے شذرات، مضامین اور مختلف تحریروں میں وہ بار بار اس عزم کا اعادہ کرتے ہیں، وہ کسی دبستانِ فکر یا تحریک سے وابستہ نہیں اس لیے ان کی تحریروں میں کوئی حد بندی نہیں بلکہ جوش وخروش اور روانی ہے وہ قدیم روایت، مذہب، اور سماج، توہمات، انگریزیت اور رسم ورواج سے متنفر ہیں وہ نثر میں بھی قدرتی مناظر کو بڑی خوبیوں سے پیش کرتے ہیں۔ رعنائیِ خیال اور برنائیِ تحریر ان کی عبارت کی خاص صفات ہیں اسی لیے مولوی عبدالماجد دریابادی

کہ ان کی نثر پر "کلام تازہ" کا گمان ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"مدیر کلیم کی نثر میں "تازہ کلام" کا اندازہ اقتباسِ ذیل سے ہوگا۔ ہندو مسلمان دونوں کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں :-

"میں تمہاری صفوں میں سے آندھی کی طرح گزروں گا، تمہارے بے مغز سروں پر کڑی کمانوں کی طرح کڑکوں گا، اور طوفانی بادلوں کی طرح گرجوں گا۔ تم پر میرا غیظ و غضب، بپھرے ہوئے دیوتاؤں کا غیظ و غضب ہے۔۔۔۔۔۔۔ اے سور کھانے والو، اور اے نادان مسلمانو! ۔۔۔۔۔ دین دین، دھرم دھرم، کلیجہ پیپ ہوا جاتا ہے۔ ان جھوٹی اور کھوکھلی آوازوں سے ۔۔۔۔۔ اے دھوتی اور پائجامہ کے گرویدو! اے لوٹے اور بدھنے کی انجمنو! اے داڑھی اور چٹیا کے دلدادو! تمہاری کس کس حماقت پہ رحم کروں"۔

یہ جوش و خروش، غیظ و غضب اگر محض تخلص کی مناسبت سے ہے، اور یہ گرج اور چمک اور یہ جوش ریا تخلیات آتشیں، اور سب سے بڑھ کر معقول ایک صاحب کے یہ لن ترانیاں اگر اسم کلیم کی شاعرانہ رعایت سے ہیں تو اس حسنِ ادا کی داد نہ دینا ظلم ہے لیکن اگر ان کے سوا کوئی اور صنعت ملحوظ رکھی گئی ہے تو اتنا دماغ کوئی کہاں سے لائے ۔۔۔۔۔۔ خود جوش صاحب بھی تو بہت اچھے ادیب بن سکتے ہیں اگر چاہیں"۔[۵]

عبدالماجد دریا بادی کے سامنے جوش کا مکمل نثری سرمایہ نہیں تھا اس لیے وہ اپنی رائے ظاہر کرنے میں تذبذب کا شکار ہوئے ہیں۔ دراصل جوش فطرت کے پرستار ہیں اور یہ پرستاری انھیں ٹیگور کی قربت نے عطا کی ہے وہ ٹیگور کی نثر سے بہت متاثر ہیں۔ ان کے یہاں جو جلال و جمال کی دل کش عبارتیں ملتی ہیں وہ بھی ٹیگور سے اثر پذیری کا نتیجہ ہیں۔ صبح کا حسن، افق کی لو، عروسِ فطرت

---

[۵] صدق۔ عبدالماجد دریا بادی۔ ج اول نمبر ۳ مورخہ ۱۱ مارچ ۱۹۳۶ء

شبنم کے قطرات، شبِ مہتاب کا حسن، جوش کے دل کو کھینچتا ہے اور وہ ان سب دل پذیر کیفیات کے آئینے میں "لوحِ محفوظ کا مطالعہ اور شاہدِ معنی کا رخسار" دیکھ لیتے ہیں۔

جوش کی رومانیت ان کی نثر نگاری میں بھی نمایاں ہے۔ ان کے مجموعہ نثر و نظم یعنی "روحِ ادب" میں اس طرح کے نثر پارے مل جاتے ہیں جن میں وہ موسمِ بہار کے مناظر کے سامنے اپنے آپ کو سپرد کیے ہوئے ہیں۔ یہاں ان کا صرف سر ہی نہیں دل بھی خم ہو جاتا ہے اور وہ رندانہ وار حسن و عشق، صداقت اور گل و بلبل کے گن شباب نغمے الاپتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالودود خاں نے اسی بنا پر جوش کو ادبِ لطیف کے مصنفین میں شامل کیا ہے بقول ان کے:

"جوش کا جمالیاتی احساس پاکیزہ ہے۔ ان کی تحریروں میں تخئیل کی رومانیت، جمالیاتی احساس کے علاوہ اظہارِ بیان میں انشا پردازی کی وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ادبِ لطیف کے لازمی عنصر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جوش بھی ٹیگور سے متاثر ہوئے۔ خصوصاً ان مضامین سے جو "روحِ ادب" میں شامل ہیں۔ ٹیگور کی تقلید ظاہر ہوتی ہے۔ "روحِ ادب" کا حصۂ نثر "مقالاتِ زریں، اوراقِ سحر اور "اشارات" کے چند مضامین اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر سرمایۂ ادبِ لطیف میں جگہ حاصل کر لیتے ہیں۔" [1]

ادبِ لطیف کے نثر نگاروں کی طرح جوش کی نثر میں بھی جمالیاتی احساس کی شدت پائی جاتی ہے جس پر ان کی طبعی رومانیت پسندی سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے شعوری طور پر نہ تو ادبِ لطیف کی نثر نگاری اپنائی اور نہ دانستہ طور پر رومانیت کی تحریک سے وابستہ ہوئے۔

---

[1] اردو نثر میں ادبِ لطیف۔ ڈاکٹر عبدالودود خاں ص ۲۵۳، ۲۵۴
نسیم بک ڈپو لکھنؤ ماہ ستمبر ۱۹۶۷ء

دراصل ان کے اسلوب میں رنگینی ان کی افتادِ ذہنی اور طبعی کی دین ہے۔ جہاں دشت و صحرا کا گزر ہی نہیں بلکہ بے آب و گیاہ میدان کو بھی زعفران زار بنا دیا۔ ان کی طبیعت کا کمال تھا۔ چنانچہ وہ خشک اور مایوس موضوع کو بھی منظر کشی اور فنی چابکدستی سے احساسِ جمال اور شعورِ حسن بخشتے ہیں۔ وہ درد و غم کے مناظر کو بھی جامۂ نثر میں بڑی جاذبیت سے پیش کر دیتے ہیں" نوجوان بیوہ اور طویل رات" کی ایک عبارت ملاحظہ ہو اس میں اشک افشانی کرنے والی بیوہ نے اپنے آنسوؤں کو اپنی سالگرہ کے ریشمی دھورے میں پرو لیا ہے اور صبح تک یہ ڈورا آنسوؤں کا ایک ہار بن گیا ہے:

"رونے والی نے تھرّاتے ہوئے ہاتھوں سے یہ نادر تحفہ تاروں بھری رات کی خدمت میں پیش کیا۔ رات سناٹے میں آگئی ...... تاروں کے آنسو بہنے لگے... صبح نے ٹھنڈی سانس کھینچی ...... اور سویرا ہو گیا۔"[1]

جوشؔ نے اپنی زندگی کی کوئی بھی چیز اور کوئی بھی حادثہ پوشیدہ نہیں رکھا ہے۔ بہت سی تفصیلات کا علم تو اُن کی خود نوشت "یادوں کی برات" سے ہو جاتا ہے مگر اس خود نوشت کے پہلے بھی وہ بہت بے باک انداز سے کام لیتے رہے ان کی تحریروں میں ایک رند مشرب اور رومانی انسان کی داستانِ حیات کے تابندہ نقوش ملتے ہیں۔ ایک عبارت ملاحظہ ہو:

"میں نے اپنی جوانی کو جنگل کے پھول کی طرح ضائع نہیں ہونے دیا۔ میں نے اس کی ایک ایک پنکھڑی کا رس چوسا ہے۔ میں نے جوانی کے ایک ایک لمحے کو نچوڑا ہے۔"[2]

ایک اقتباس اور ملاحظہ ہو:-

---

[1] روحِ ادب (نوجوان بیوہ اور طویل رات) ص ۱۹۰

[2] اشارات جوشؔ ملیح آبادی ص ۴۱

" میں نادرہ کنواریوں سے سرگوشیاں کروں گا، عود و عنبر، شراب و گیسو کی خوشبوؤں میں جھولوں گا۔ دہکتے ہوئے رخساروں میں منہ دیکھوں گا اور مہکتے ہوئے لبوں پر مہر نشاط ثبت کروں گا...... میں سازوں کے نغموں، گھنگروؤں کی جھنکاروں، کوئلوں کی کوکو، ساغروں کی کھنک اور کھیر دینے والی جوانیوں کی مست دھنوں پر قدم اٹھاتا ہوا وہاں پہنچ جاؤں گا جہاں پیری باریاب نہیں ہو سکتی اور جب صبح طالع ہوگی تو میں اپنے اس قدر شگفتہ، سرشار اور مضبوط، تر و تازہ اور جوان ہمت ملوں گا کہ پیری کے پاؤں اکھڑ جائیں گے۔" [1]

جوش کے مندرجہ بالا اقتباسات نثر کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ لفظوں کے در و بست پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں اور نثر کو بھی ہم پلہ نظم بنا دیتے ہیں۔ وہ اردو نثر پر اپنے قلم سے مہر نشاط ثبت کر دیتے ہیں۔ وہ دنیائے تصور آباد نہیں کرتے بلکہ لمحۂ موجود میں یقین رکھتے ہیں۔ رموز و کنایات کی زبان میں جوش بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ الفاظ کی تراکیب میں بڑا سلیقہ برتتے ہیں جس سے بھاری بھرکم الفاظ بھی خوبصورت معلوم ہونے لگتے ہیں۔ یہ خوبیاں جوش کی سبھی عبارتوں میں قابلِ دید ہیں۔ روحِ ادب مقالات زریں (نثری اقوال) اوراقِ سحر (شاعرانہ اقوال) اشارات اور یادوں کی برات میں جوش کی شاعرانہ تخئیل رومانی فضا میں مسکراتی ہوئی دکھائی پڑتی ہے جس پر ان کا حسین اسلوب اور مسحور کر لیتا ہے۔ ایک اقتباس اور ملاحظہ ہو جس سے ان کی تمثیلی نثر نگاری کا حسن ظاہر ہوتا ہے اور ان کا جمالیاتی احساس کس قدر زندہ اور توانا ہے اس کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔

" وہ اگر آدمیوں کے سامنے آتے بھی ہوں تو ان شوخ و شنگ لڑکیوں کی طرح

---

[1] اشارات جوش ملیح آبادی ص ۷۶

جو دور سے تو خوب لگاوٹ دکھاتی ہیں لیکن جب ان کا دامن پکڑنے کے لیے ہکو تو انگلیاں چکاتی اور قہقہے مارتی ہوئی الٹے پاؤں بھاگ جاتی ہیں ......

"الفاظ کی ٹولیوں کی ٹولیاں جن میں بوڑھے جوان، لڑکے لڑکیاں سبھی ہوتے ہیں شاعر کے پاس ہواؤں کے دوش پر آتے ہیں اور اس کی معنویت کے گرد حلقہ باندھ کر اس طرح ناچتے اور گاتے ہیں کہ کبھی تو ماہی سے ماہ تک تبسم ہی تبسم جھلکنے لگتا ہے اور کبھی ذروں سے لے کر ستاروں تک آنسو ہی آنسو نظر آتے ہیں" [1]

جوش کی نثر نگاری کے چند نمونے یہاں پیش کیے گئے۔ ان اقتباسات میں شگفتگیِ الفاظ بھی ہے اور کہیں کہیں لفظوں کی مینا کاری بھی۔ وہ کسی فنی التزامات کے پیش نظر نثر نہیں لکھتے بلکہ فطری طور پر ان کا قلم گل کترتا چلا جاتا ہے وہ کسی اصلاحی اور سماجی رنگ کو بطور تحریک نہیں قلم بند کرتے بلکہ طبیعت کی اٹھان کے طور پر جو کچھ مشاہدۂ باطن وظاہر کا نتیجہ ہوتا ہے سپرد قلم کر دیتے ہیں۔ یہ ان کی نثر نگاری کی صداقت ہے جو قابلِ قدر ہے۔

جوش اپنی نثر کو فلسفیانہ انداز اور نفسیاتی الجھاؤ سے معمہ نہیں بناتے بلکہ الفاظ کو فاتحانہ انداز میں برتتے ہیں جس میں ان کی شخصیت کا پر تو بھرپور جلوۂ صد رنگ دکھاتا ہے۔ وہ بے جان لفظوں میں بھی اپنی شخصیت کی رنگا رنگی سے روح پھونک دیتے ہیں۔ جوش لفظوں سے بہشت زار اور جہنم زار بنانے کا فن بخوبی جانتے ہیں۔ نئے نئے الفاظ اور نئی نئی تراکیب میں ایمائیت، اور رمزی علامتوں کا رنگ بھر دینا ان کی نثر نگاری کا امتیاز ہے اودھی کے مقامی الفاظ بھی ان کے یہاں گہری معنویت کے حامل ہیں ان لفظوں کا سیاق وسباق سمجھے بغیر خاص لطف نہیں آسکتا مگر ان کو اس طرح سے استعمال کیا ہے کہ نہ جاننے والا بھی محل استعمال سے لطف اندوز ہو جاتا ہے۔

---

[1] اشارات جوش ملیح آبادی ص ۴۳ اور ۴۴

خطوط نگاری بھی اب فن قرار پا گئی ہے اور اب تو خطوں سے شاعر
ادیب اور فن کار کی شخصیت کا تعین ہونے لگا ہے۔ خطوط نگار کے نفس کی
پرچھائیاں تلاش کی جانے لگی ہیں۔ ظاہر ہے کہ خطوط نگاری کی ابتدا میں
بے چارے خطوط نگاروں نے ایسے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ان کے رقعوں
کے پرزے اڑائے جائیں گے اور پھر تعبیرات مکمل کی جائیں گی اور آج بھی
خط لکھنے والا ان سب امور پہ غور نہیں کرتا بلکہ وقتی اور فوری ضرورت
کے لیے خط لکھے جاتے ہیں جو مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ لیکن بعد کو یہی
رقعات ماضی کی معلومات کا وسیلہ بن جاتے ہیں اور حال کا احتساب کرتے
ہیں، مستقبل کو آئینہ دکھلانے لگتے ہیں۔ مکتوب نگار کی شخصیت، انداز فکر،
نظریہ اور علمیت و ادبیت کا معیار بھی خطوط ٹھہرائے جاتے ہیں۔

جوش کی خطوط نگاری میں بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے وہ گھوم
پھر کے اپنی مالی پریشانیوں اور دشواریوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اپنے عادات
وخصائل کے ساتھ معمولات کی تکرار پیش کرتے ہیں۔ جس میں ان کا ذہنی
کرب ملتا ہے۔ ان کے انتیس ۲۹ خطوط، نقوش کے خطوط نمبر جلد ۳ میں شائع
ہوئے ہیں جو تمکین کاظمی، سید مبارک شاہ جیلانی، محمد صادق اور دل شاہجہاں پوری
کے نام ہیں۔ دو خط ملاحظہ ہوں:-

بنام تمکین کاظمی

"کیوں حضرت! مومن کے کلام پہ رائے لینے کا جب موقع آیا تو آپ نے
اس شخص کو یاد فرمایا جسے آپ مردہ سمجھ کر دل سے بھلا بیٹھے تھے۔ میں پوچھتا
ہوں آپ نے اب تک کیوں دریافت نہیں فرمایا کہ جوش زندہ ہے یا مر گیا۔
رہا یہ امر کہ میں نے خط کیوں نہ لکھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کس کافر کو آپ کا پتہ
معلوم تھا۔ اب رہے حیدرآباد کے دوسرے احباب سوا ان بے چاروں ہی کو خط لکھنے
کی کب توفیق ہوتی ہے۔ اس قدر ہولناک صورت سے مشغول رہتا ہوں کہ خود سے

کبھی اب گاہے ماہے ملاقات نہ رہ گئی ہے۔

آپ مومن خاں کی شاعری کے باب میں میری رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں:
غزل گوئی محض ایک رسمی اور غلط چیز ہے۔ مومن کا بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے رسمی اور غلط چیز میں ایک بڑی حد تک رنگینی و دلکشی پیدا کر دی تھی
علی اختر کے پتے سے مطلع فرمایئے۔ آپ کہیں دہلی آ سکیں گے؟
میں یہاں بہت خوش ہوں، اور مہربان قدرت کے فیوض سے بہرہ مند۔

نیاز مند

جوش دہلی ۲۹ جنوری ۱۹۳۷ء

بنام جناب میاں محمد صادق صاحب۔ مسلم ٹاؤن لاہور

ملیح آباد لکھنؤ۔ ۴ جون ۱۹۲۹ء

میرے محبوب میاں صاحب، جوڑی بخار کے تواتر اور تسلسل نے میری ہڈیاں تک توڑ ڈالی ہیں، اس پر طرہ گرمی اور لو۔ العظمۃ للہ! خط کیا لکھ رہا ہوں ایک خواب پریشان دیکھ رہا ہوں، یا یوں سمجھ لیجیے سرسام میں ہذیان بک رہا ہوں۔

آپ کا خط اس قدر خطِ شکست میں لکھا گیا ہے کہ میں اسے اچھی طرح پڑھ نہیں سکا ہوں، ذرا ہاتھ روک کر لکھتے تو کون سا نقصان ہے اپنی مطبوعہ کتابوں کا ایک ایک ایڈیشن مع کتاب صد رشیدیہ کتب خانے کے ہاتھ فروخت کر چکا ہوں۔ اب ایک نیا مجموعہ طیار کر رہا ہوں۔ اس کے متعلق ناشروں سے بات چیت کیجیے۔ اگر اس نئے مجموعے کو میں چھاپ دوں گا تو اسے پچاس فی صد قیمت پر فروخت کروں گا، اور اگر کوئی ناشر اسے چھاپے گا تو تیس فی صدی نقد رائلٹی لے کر ایک ہزار کے ایڈیشن کا اختیار دے دوں گا۔

ملیح آباد کے سناٹے، اور خصوصیت کے ساتھ شام کے وقت میرا بری طرح تعاقب کرتے ہیں۔ کبھی پاس آ کر بغل گیر ہو جاتے ہیں اور کبھی دور سے مسکراتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو بھول جاؤں اور اس عذاب فراق سے نجات پاؤں، مگر یہ میرے بس کی بات نہیں، آپ کو تو سینکڑوں جوش مل جائیں گے، مگر مجھے ایک صادق کبھی نہیں ملے گا کیسی شدید بے چارگی ہے۔

اگر آپ کسی روز اچانک یہاں آ جائیں، تو میں خوشی کے مارے رقص کرنے لگوں، مگر یہ میری قسمت کہاں؟۔

جولائی کے پہلے ہفتے میں ضرور آئیے گا۔ مدت کے بعد باغوں میں آم کھائیں گے، تالابوں میں نہائیں گے، شاخوں میں جھولا جھولیں گے۔ رنگین گھٹاؤں کے رنگین سایوں میں ملار گائیں گے۔ شام کو بادہ گلگوں کا آپ کے علی الرغم دور چلے گا، اور غریب انسان کے حق میں دعائے خیر کی جائے گی۔

آپ کا پرستار - مرحوم جوش

مندرجہ بالا دونوں خطوں میں جوش نے اپنی افتاد مزاج دکھلائی ہے ایک خط جو بنام تمکین کاظمی ہے۔ اپنی غزل بیزاری کے تعلق سے مومن کی غزل گوئی کی خصوصیت مختصر لفظوں میں لکھ دی ہے جس میں ان کا نظری بانکپن جھلکتا ہے۔ دوسرا خط اپنے محب صادق کو لکھا ہے جس میں اپنی بیماری کا حال اور ان کی بدخطی کا شکوہ، اپنی کتابوں کی اشاعت اور رائلٹی کی تفصیل ملتی ہے۔ اس خط کا سب سے اہم پہلو بہ اعتبار مضمون اور عبارت وہ ہے جس میں ملیح آباد کے سناٹے کے ساتھ ہنگام شام عذاب فراق، تالاب، باغات اور جھولوں کا ذکر ہے۔ یہ جوش کی خطوط نگاری کا وصف ہے کہ وہ کسی بھی عالم میں پرکیف مناظر کو پس پشت نہیں ڈالتے۔ وہ اپنی حیات میں ہی اپنے کو مرحوم لکھنے لگے تھے۔ مگر ان کی

پژمردگی اور افسردگی، قدرتی مناظر اور فطرت کی
فیاضیوں کے سامنے شگفتگی میں بدل جاتی تھی۔ جوش اصلیت اور واقعیت
کو تمام تر محسنات کے ساتھ لکھ دیتے ہیں۔ ان کے خطوط میں ابلاغ کا مسئلہ
بڑی خوبی سے حل ہو جاتا ہے۔ ان میں مختلف پہلوؤں کو بے ساختگی و
برجستگی، خیال انگیزی و رعنائی خیال، شدت جذبات اور وفور شوق کو فن کارانہ
انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جوش سادہ تفصیل نگاری کو بھی رنگین سے
رنگین تر بنا دینے میں یقین رکھتے ہیں۔ یہ کیفیت ان کے سبھی خطوط میں ملتی ہے۔

اردو میں آج بھی خود نوشت سوانح کا رواج زیادہ نہیں لیکن پھر بھی
اس جانب اہل قلم متوجہ ہو رہے ہیں۔ معلوم نہیں میر تقی میر نے اپنی سوانح
"ذکر میر" (فارسی) میں کس عالم میں مرتب کی تھی کہ اردو شعرا و ادبا نے
اس صنف ادب کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں کی۔ یوں بھی خود نوشت سوانح بہت
مشکل کام ہے۔ صداقت روایات کے ساتھ، واقعات کو اس طرح قلم بند کر دینا
کہ دلچسپی بھی قائم رہے، واقعی دشوار مرحلہ ہے۔ لیکن خوشی ہے کہ جوش
نے اس سمت بھرپور توجہ فرمائی ہے۔ ان کی خود نوشت "یادوں کی برات"
بڑی بے باک، بے خوف اور بے حجاب ہے۔ وہ اپنی کسی کمزوری یا خامی پر
خاک نہیں ڈالتے بلکہ دل نشین انداز میں جزئیات نگاری سے بھی کام لیتے
ہیں۔ اس میں شخصی خاکے بھی بڑے کام کے ہیں گو کہ ان شخصی خاکوں میں جوش
اعتدال نہیں برت سکے ہیں اور اسی خاکہ نگاری نے اس خود نوشت کو طویل
بنا دیا ہے مگر یہ خاکے بڑے خاصے کے ہیں۔ تاریخ اور سنین کے اعتبار سے
یہ مستند نہیں قرار دی جا سکتی۔ اس کا اعتراف خود مصنف نے بھی کیا ہے۔

نظریات و عقائد کے اعتبار سے بھی جوش نے وضاحت سے کام نہیں
لیا ہے۔ بلکہ جہاں تفصیلات بیان کی ہیں معاملہ کچھ زیادہ پیچیدہ ہو گیا ہے۔
اپنے معاشقوں کا حال بہت چٹخارے لے کر بیان کیا ہے۔ خیریت یہ کی ہے
کہ کچھ کے نام اشاروں میں لکھ دیے ہیں۔ خاکوں میں اکثر و بیشتر مقفیٰ اور مسجع

فقروں کی تمام تھام دکھائی دیتی ہے۔ فراق گورکھپوری کے خاکے کی ابتدا
ان جملوں سے ہوتی ہے :-

"مجموعۂ اضداد، آمیز بلور و فولاد، گاہ نسیم بوستان گاہ، صرصر بیابان
گاہے خضر درگاہ، گاہے گم کردہ راہ، گاہ شبنم برگ تاک، گاہ شعلۂ جوالہ
و بے باک، گاہ یزداں بآغوش، گاہ اہرمن بردوش۔
رند قدح خوار، گوہر شاہوار، آسمان خوش ہمچگی کے بدر، انجمن آگہی
کے صدر۔
اولیائے ذہانت کے سپہ سالار، اقلیم ژرف نگاہی کے تاجدار، جودیناہ
نقادِ نگاہ، ہبطِ جبریل، شاعرِ بزرگ و جلیل۔
اپنے فراق کو میں قرنوں سے جانتا ہوں رسائلِ علم و ادب پہ جب وہ
زبان کھولتے ہیں تو لفظ و معنی کے لاکھوں موتی رولتے ہیں اور اس افراط
سے کہ سامعین کو اپنی کم سوادی کا احساس ہونے لگتا ہے"۔ [۱]

شوکت علی خاں فانی بدایونی کا خاکہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

"تاج باختہ بادشاہوں، روزگار گزیدہ فن کاروں، امید بریدہ مرتضوں
شیب دریدہ محبوبوں عشق سوختہ عاشقوں، پریدہ رنگ بیو[illegible]سوں،
پژمردہ بالوں اور پدرگم کردہ یتیموں کے خیمۂ سوگواری میں بیٹھ کر۔ مغموم قدرت
نے ــــ غم دوراں و غم جاناں کے آفات، دو رکفر کے مصائب اور شوریٰ بارہ کی
نامرادی کے طشت میں ـــــ دیوار گریہ کی مٹی کو ـــ میر تقی میر کے آنسوؤں میں
تر کر کے گوندھا۔ اس مٹی سے ایک دبلا پتلا گندمی رنگ کا پتلا بنایا۔ اس پتلے کے
دھڑکتے دل میں تمنائے مرگ کی روح پھونک دی اور نام رکھ دیا اس کا فانی
بدایونی۔ میں سب سے پہلے ان سے لکھنؤ میں ملا تھا جہاں وہ اسی طرح وکالت کرتے

---

[۱] یادوں کی برات ص ۸۰ ۸

تھے کہ سچ میں بہ مشکل دو ایک بار عدالت جاتے زیادہ وقت محبوب کے گھر گھپاتے اور فرصت کے اوقات میں مقدمات کی مسلیں دیکھنے کے عوض مجھ کو اپنی معشوقہ کی تصویر دکھاتے اور پہروں اس کی داستانیں سناتے تھے۔"[1]

جوش تشبیہات و استعارات کی زبان میں بڑے سے بڑے نکتے کو سلاست روی سے بیان کر جاتے ہیں شوکتِ الفاظ اور حشمت تراکیب سے نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور مقفیٰ عبارت کی گھن گرج سے ذہن پریشان ہو جاتا ہے، جوش نے نثر نگاری میں اپنی طوالت پسندی کے جادو جگائے ہیں اس لیے کہ اس قدر تکلفات کے باوصف ان کی عبارت آرائی گراں نہیں گزرتی۔ دراصل اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ جوش کی نثر نگاری میں ان کی شخصیت اور اسلوب کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان کے یہاں ایک صاحب طرز انشاپرداز کی تمام شان ملتی ہے۔ بقول ڈاکٹر گیان چند جین:

"صرف اس کتاب کی وجہ سے جوش کو اردو کے صفِ اول کے انشاپردازوں میں وجہی، امن، سرور، محمد حسین آزاد، سرشار، ابوالکلام، نیاز اور رشید احمد صدیقی وغیرہ کے ساتھ جگہ دی جائے گی۔"[2]

---

[1] یادوں کی بارات ص ۳۶۶

[2] تجزیے، ڈاکٹر گیان چند جین ص ۲۶۹ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۱۹۷۳ء

کتابیات

۱۔ انتخابِ جوش۔ مرتبہ پروفیسر احتشام حسین و ڈاکٹر مسیح الزماں
کتاب محل لمیٹڈ۔ زیرو روڈ۔ الہ آباد۔

۲۔ اثر کے تنقیدی مضامین۔ جعفر علی خاں اثر لکھنوی۔ نظامی بک ایجنسی
بدایوں بار دوم ۱۹۵۶ء

۳۔ ادب اور نظریہ۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ ادارۂ فروغِ اردو
لکھنؤ ۱۹۶۴ء

۴۔ اردو رباعیات۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی۔ نسیم بک ڈپو۔ لکھنؤ

۵۔ اردو مرثیہ کا ارتقا۔ ڈاکٹر مسیح الزماں۔ کتاب نگر۔ لکھنؤ

۶۔ اردو ادب میں رومانوی تحریک۔ پروفیسر محمد حسن۔ شعبۂ اردو مسلم
یونی ورسٹی علی گڑھ۔ ۱۹۵۵ء

۷۔ اردو شاعری پر ایک نظر۔ پروفیسر کلیم الدین احمد۔ حصہ دوم دوسرا ایڈیشن
اردو مرکز پٹنہ ۱۹۵۶ء

۸۔ دکن میں اردو۔ نصیر الدین ہاشمی

۹۔ دکن میں عزاداری اور مرثیہ۔ ڈاکٹر رشید موسوی

۱۰۔ یادوں کی برات۔ جوش

۱۱۔ تعارف تاریخِ اردو۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

۱۲۔ مقدمۂ شعر و شاعری۔ حالی

۱۳۔ کاشف الحقائق۔ امداد امام اثر

۱۴۔ شناسا چہرے۔ پروفیسر محمد حسن۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۷۹ء

۱۵۔ مراثی نسیم جلد دوم، کراچی

۱۶۔ ادبی تبصرے۔ عبدالحق۔ طبع دوم دانش محل لکھنؤ ۱۹۶۴ء

۱۷۔ اردو نثر میں ادب لطیف۔ ڈاکٹر عبدالودود خاں۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۶۷ء

۱۸۔ روحِ ادب جوش

۱۹۔ اشارات جوش

۲۰۔ تجزیے۔ ڈاکٹر گیان چند جین۔ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ دہلی ۱۹۷۳ء

۲۱۔ شعلہ و شبنم جوش

۲۲۔ الہام و افکار "

۲۳۔ نقش و نگار "

۲۴۔ فکر و نشاط "

۲۵۔ جنون و حکمت "

۲۶۔ حرف و حکایت "

۲۷۔ موجد و مفکر "

۲۸۔ عرش و فرش "

۲۹۔ سیف و سبو "

۳۰۔ سنبل و سلاسل "

۳۱۔ آیات و نغمات "

۳۲۔ جوش ملیح آبادی کے مرثیے ضمیر اختر نقوی

۳۳۔ جوش کی رومانی رباعیاں عصمت ملیح آبادی

۳۴۔ تاریخِ ادب اردو ڈاکٹر اعجاز حسین

رسائل و اخبارات

۱۔ نقوش لاہور خطوط نمبر ۲ اپریل۔مئی ۱۹۶۸ء

۲۔ درس علی گڑھ اپریل۔مئی ۱۹۵۲ء

۳۔ صدق لکھنؤ ۱۱ر مارچ ۱۹۳۶ء

۴۔ کلیم دہلی

مصنف ایک نظر میں

نام :- ڈاکٹر سید فضل امام رضوی (فضل امام)
تعلیم :- ایم، اے، پی۔ایچ۔ڈی۔ڈی۔لٹ (اردو)
پیدائش :- ۷؍اگست سنہ ۱۹۴۲ء
موضع پاینده پور۔ ضلع اعظم گڑھ
مشغلہ :- درس وتدریس
شعبۂ اردو فارسی، راجستھان یونی ورسٹی، جے پور

دیگر کتب (اردو)

بھوجپوری ادب کا تعارف (بہار اردو اکاڈمی سے انعام یافتہ سنہ ۱۹۷۲ء
امیر اللہ تسلیم۔ حیات اور شاعری (اتر پردیش اردو اکاڈمی سے انعام یافتہ سنہ ۱۹۷۴ء

مثنوی خنجر عشق۔ تسلیم (ترتیب ومقدمہ) سنہ ۱۹۷۴ء

جدید ہندی شاعری۔ سمت ورفتار (اتر پردیش اردو اکاڈمی کے اشتراک سے شائع سنہ ۱۹۷۵ء

نغمۂ مسلسل یا گوہر انتخاب۔ تسنیم (ترتیب ومقدمہ) سنہ ۱۹۷۶ء

افکار ونظریات (تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ (اکاڈمی سے انعام یافتہ) سنہ ۱۹۷۷ء

دیوانِ درد کا نقشِ اول (اکاڈمی سے انعام یافتہ) سنہ ۱۹۷۹ء

راجستھانی زبان وادب (اکاڈمی سے انعام یافتہ) سنہ ۱۹۸۱ء

انیس شناسی (ترتیب) سنہ ۱۹۸۱ء

موازنۂ انیس و دبیر (ترتیب و مقدمہ) ۱۹۸۱ء

(زیرِ طبع)

انیس: شخصیت اور فن (تحقیقی مقالہ برائے ڈی لٹ)

(ہندی کتب) مطبوعہ

اردو ساہتیہ، ایک جھلک حصہ اول ۱۹۷۵ء

" " " " حصہ دوم ۱۹۷۶ء

ہماری مطبوعات ایک نظر میں

کتاب	مصنف	قیمت
آنکھیں ترستیاں ہیں (یادداشتیں)	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	۳٦/=
اے پیارے لوگو (تنقیدی مضامین)	وارث علوی	۴۰/=
اداس شام کے آخری لمحے (افسانے)	کشمیری لال ذاکر	۱۲/-
اداسی کے پانچ روپ (شاعری)	کرشن موہن	۲۰/=
انکار عبد الحق	مرتبہ : آسنہ صدیقی	۳۵/=
انتظار حسین کے ۱۷ افسانے	انتظار حسین	۱۸/=
ارمغان بہار (شاعری)	اے، سی، بہار	۱۰/=
آگ (ناول)	جمنا داس اختر	۵/=
آواز کا جسم (شاعری)	مخمور سعیدی	۱۰/=
اڑان (شاعری)	شباب للت	٦/=
امرائی (شاعری)	بدیع الزماں خاور	۱۰/=
اعتراف (شاعری)	عبدالرحیم نشتر	۴/۵۰
انتظار کی رات (شاعری)	کمار پاشی	۸/=
انسانی حقوق کیا ہیں ؟	موریس کرانسٹن	۷/=
احساسات (شاعری)	اوم پرکاش لاغر	۵/=
انیس سو چوراسی (باتصویر ناول)	جارج آرویل	۱۲/=

بادۂ صافی (شاعری)	صوفی بانکوتا مرحوم	۱۵/=
بسمل سعیدی ـــ شخص اور شاعر	گوپال متل	۱۲/=
بادل گرجیں جمنا پار (افسانے)	سدرشن شرما	۱۲/=
برنٹ پر مکالمہ (افسانے)	سریندر پرکاش	۱۸/=
بردہ فروش (ناول)	جمنا داس اختر	۵/=
رنگ سبز (شاعری)	آزاد نوری	۱۰/=
بھیگا ہوا کاغذ (شاعری)	تمنا زراشد	۱۰/=
بند کواڑ (افسانے)	نریندر لوتھر	۶/=
بیاض (شاعری)	بدیع الزماں خاور	۴/=
بے وفا (ناول)	نریندر ریترا	۶/=
پہلی کرن کا بوجھ (شاعری)	مغنی تبسم	۱۲/=
پھول کھلے ویرانے میں (افسانے)	حسن نجمی	۱۰/=
تکون کا کرب (شاعری)	آزاد گلاٹی	۵/=
تنقید اور تخلیقی تنقید (مقالات)	ڈاکٹر وزیر آغا	۲۰/=
تیشۂ نظر (مضامین)	ابوالفیض سحر	۸/=
تین چہرے ایک سوال (کہانی)	کشمیری لال ذاکر	۲/۵۰
تفسیر اسفر (شاعری)	سلیمان خمار	۱۵/=
چوری سے یاری تک (انشائیے)	ڈاکٹر وزیر آغا	۱۸/=
چند ادبی شخصیتیں (خاکے)	شاہد احمد دہلوی	۳۰/=
حروف (شاعری)	بدیع الزماں خاور	۴/۵۰
حماقت (ناول)	گہر لدھیانوی	۶/=
حصار آب (شاعری)	حیات لکھنوی	۱۰/=
خالی خانے (ڈرامے)	انل ٹھکر	۱۵/=

خرابہ (شاعری)	من موہن تلخ	۱۰/=
خوابِ تماشا (شاعری)	کمار پاشی	۵/=
دل کے دروازے (ناول)	عطیہ پروین	۲۵/=
دائروں کا سفر (شاعری)	شباب للت	۱۵/=
دامانِ باغباں (شاعری)	محمد عثمان عارف	۵/=
دینار (شاعری)	نوجیون ازگرے / بدیع الزماں خاور	۱۰/=
دیپک راگ (شاعری)	مظفر حنفی	۶/=
روشنی پھر روشنی ہے (شاعری)	بل کرشن اشک	۱۰/=
رو برو (شاعری)	کمار پاشی	۱۰/=
راکھ (شاعری)	احتشام اختر	۶/=
راہ گزر (شاعری)	دل ایوبی	۴/=
راجستھانی زبان و ادب (ایک تعارف)	ڈاکٹر افضل امام	۱۲/=
زرد چاندنی (ناول)	عطیہ ہما	۳۵/=
زندگی اے زندگی (شاعری)	شکیل دسنوی	۱۰/=
سوگنڈل پاور کا بلب (۲۱ افسانے)	منٹو	۱۸/=
سپنے کب اپنے (ناول)	فرخندہ شمیم	۲۴/=
سنی ہے دل نگار اختر شیرانی کی حیاتِ معاشقہ	نیر واسطی کے قلم سے	۱۸/=
ساحر لدھیانوی (ایک مطالعہ)	مخمور سعیدی	۳۰/=
سبیل (شاعری)	بدیع الزماں خاور	۱۰/=
سات سمندر (شاعری)	بدیع الزماں خاور	۲۰/=
سحر حرف (شاعری)	ساحر ہوشیار پوری	۲۰/=
شہپر (شاعری)	حرمت الاکرام	۸/=

شہرِ خوشبو (شاعری)	نور تقی نور	۵/=
شہرِ خیال (شاعری)	جلیس نجیب آبادی	۴/۵۰
شیرازہ (شاعری)	مرتبین: مخمور سعیدی، پریم گوپال متل	۱۸/=
شیرازۂ مژگاں (شاعری)	کرشن موہن	۱۰/=
صحرا میں اذان (شاعری)	گوپال متل	۱۵/=
صحرا کی پیاس (شاعری)	شباب للت	۶/=
صریرِ خامہ (شاعری)	مظفر حنفی	۶/=
غم کے سائے	بیگم محمودہ بشیر	۳۵/=
کرماں والی (ناول)	کشمیری لال ذاکر	۲۰/=
کلیاتِ شاد عارفی	مرتب: مظفر حنفی	۳۰/=
کلیاتِ اختر شیرانی	مرتب: گوپال متل	۱۰/=
کوئے ملامت (شاعری)	کرشن موہن	۱۰/=
کینسر وارڈ (ناول)	الیگزینڈر سولنسٹین	۱۸/=
گفتنی (شاعری)	مخمور سعیدی	۶/=
گلاگ مجمع الجزائر (یادداشتیں)	الیگزینڈر سولنسٹین (مجلد) فی جلد	۴۰/=
— تین جلدوں میں —	(غیر مجلد) فی جلد	۱۰/=
گیان مارگ کی نظمیں (شاعری)	کرشن موہن	۱۰/=
گوپال متل — ایک مطالعہ	عبدالحکیم	۱۵/=
لاہور کا جو ذکر کیا (یادداشتیں)	گوپال متل	۱۰/=
لال قلعہ (ناول)	صفدر آہ	۸/=
لفظوں کا پیرہن (شاعری)	بدیع الزماں خاور	۷/=
لبِ منصور (شاعری)	دھرم سروپ	۹/=
قصۂ جدید و قدیم (ایک ادبی مباحثہ)	مرتب: مخمور سعیدی	۱۸/=